Phone : 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جنوری 1964

IN MEMORY OF THE QUAID

There is a special feature of the Islamic State which must not be overlooked. There, obedience is due to God, which takes practical shape in the observation of the Quranic principles and commands. In Islam, obedience is due neither to a king, nor to a parliament nor to any individual organisation. It is the Quranic provisions which determine the principles of our freedom and discipline in political and social spheres. In other words, Islamic state is an agency for enforcing Quranic principles and injunctions.

(Quaid-e-Azam)
(In reply : to a question in Hyderabad in 1941)

شائع کردہ :

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گل برگ لاہور

قیمت ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک	قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون نمبر (۸۰۸۰۰)
پاکستان و ہند سے سالانہ دس روپے	پاکستان و ہند سے	خط و کتابت کا پتہ
غیر ممالک سے سالانہ ایک پونڈ	ایک روپیہ	ناظم طلوعِ اسلام ۲۵/بی۔ گلبرگ لاہور

جلد (۱۷)	جنوری سنہ ۱۹۶۴ء	نمبر (۱)

فہرستِ مضامین

۱ — لمعات — ۲

۲ — مولانا مودودی اور جمہوریت — ۹

۳ — معراج نبویؐ کے دو رُخ — ۳۳

۴ — باب المراسلات (اسلام اور کمیونزم) — ۴۱

۵ — نقد و نظر (مکاتیب سرسید احمد خاںؒ۔ تعبیر کی غلطی) — ۵۷

۶ — حقائق و عبر (جب اپنے پر پڑی تو... تین طلاق۔ اختلافات کی نوعیت۔ فریب دہی کی انتہا) — ۶۵

۷ — عائلی قوانین میں ترامیم — ۷۱

۸ — رابطۂ باہمی — ۷۵

۹ — بچوں کا صفحہ — ۷۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

بانیٔ پاکستان کے یوم ولادت کی بنا پر ۲۵ دسمبر کو ہمارے ہاں بڑی تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ یہ تاریخ ہمارے قلب و نگاہ میں اس سالار انقلاب کی عظمت کردار کے نقوش تازہ کر دیتی ہے جسے اپنے زندۂ جاوید اور شہرہ آفاق کارناموں کی بنا پر تاریخ میں "قائداعظم" کا قابل رشک مقام حاصل ہوا اور جس کی فتح مندیوں کا جیتا جاگتا شاہکار پاکستان کی عظیم مملکت کی صورت میں جریدۂ عالم پر جگمگا رہا ہے۔ اس محسن جلیل کے حسن تدبر اور عزم صمیم نے ہماری فریب خوردہ، بھولی بھٹکی، زوال پذیر اور منتشر سی قوم کو جو لباس سیاست پر قدم بہ قدم مات کھا رہی تھی، از سر نو آزادی و استقلال کی گم گشتہ منزلوں کا سراغ دیا۔ ان منزلوں کے لئے نشان راہ عطا کئے۔ اور وحدت فکر و عمل کی وہ امنگیں بخشیں جن کے صدقے میں یہ ملت درماندہ پورے عزم، ہم آہنگی اور یکجہتی سے آغاز سفر کے قابل ہو گئی۔ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء میں اس نے اپنی منزل کا تعین کیا اور اگست سنہ ۱۹۴۷ء میں یہ منزل مراد اس کے قدم لے رہی تھی۔

نشاۃ ثانیہ کی اس داستان کا تجزیہ کیجئے تو واقعات و حقائق اس امر کی شہادت دیں گے کہ تحریک پاکستان کے سلسلے میں قائداعظمؒ کی قیادت کا حقیقی آغاز سنہ ۱۹۳۵ء کے اس نازک اور پُرخطر موڑ سے شروع ہوتا ہے جب کہ اس وقت کے متحدہ ہندوستان کو آقایانِ فرنگ کی بارگاہ سے صوبجاتی خود مختاری (PROVINCIAL AUTONOMY) کے اختیارات تفویض کئے جا رہے تھے۔ نیشنلزم کے دلفریب نقاب میں، ہندو جاتی نیشنل کانگریس کے جھنڈے تلے اپنی تمام قوتوں کو منظم کر چکی تھی اور صوبائی نظام حکومت پر تسلط جمانے کے لئے اس نے بڑی کامیابی سے اپنے منصوبوں کی تکمیل کا سامان کر لیا تھا۔ ایک طرف "رام راج" کے قیام کی یہ خطرناک سازش اپنے حاصل اتمام کو پہنچ رہی تھی اور دوسری طرف دس کروڑ مسلمان ریت کے ذروں کی صورت پریشان ہو کر پوری بے بسی اور بے چارگی کے عالم میں، اپنے آپ کو ان خطرات کے حصار میں پا رہے تھے۔

یہ تھا وہ نازک مرحلہ جب کہ اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک زلزلہ قیامت بپا ہوا چاہتا تھا اور اس زلزلے سے جو ہلاکت انگیزیاں رونما ہوتیں وہ یقیناً حادثۂ اندلس کی خونچکاں یاد تازہ کر دیتیں لیکن تاریخ کے اس ہولناک موڑ پر قائد اعظمؒ کی عظیم شخصیت ایک معجزہ بن کر سامنے آئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے تاریخ کا رُخ بدل دیا۔ اسلامی ہند نہ صرف حادثۂ قیامت سے بچ گیا بلکہ بازآفرینیوں کے نئے ولولے لیے ہوئے وہ زندگی اور عروج و اقبال کی منزلوں پر مردانہ وار اپنے قدم بڑھانے کے قابل ہو گیا اور جب تک تاریخ کی عظیم کامرانیوں نے اس کے قدم نہیں چومے اس کے ذوقِ سفر اور گرمیٔ رفتار میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔

قائد اعظمؒ کی سیرت و کردار کے سب سے درخشاں نقوش اس وقت مزید نکھر اور ابھر کر سامنے آتے ہیں جب ہم اپنی قوم کی اُس دور کی نفسیات کی صحیح صحیح کیفیات کو سامنے لاتے ہیں۔ ہمیں صاف صاف یہ نقشہ دکھائی دیتا ہے کہ سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد اس برصغیر کے مسلمان سیاسیات کی گزرگاہوں میں نہ تو اپنے لئے کسی منزل کا تعین کر سکے اور نہ فکر و بصیرت کی بنا پر زندگی کے کوئی ٹھوس مقاصد ان کے سامنے لائے گئے، سرسیدؒ نے ایک فکر اور منزل کا سراغ دیا لیکن جذبات پسند قوم نے اسے ایک تحریک کی شکل میں اپنانے سے گریز کیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ محض جذبات پر مبنی تھا — تحریکِ خلافت، تحریکِ ہجرت اور اس نوعیت کی دیگر ہنگامی تحریکوں کے نام پر انہوں نے سیاسیاتِ ہند میں جو ہنگامے بپا کیے ان کی کیفیت بگولوں کے رقص سے زیادہ نہیں تھی۔ جذباتی ہنگاموں کے ذریعہ انہوں نے جو طوفانِ قیامت بھی پیدا کیا وہ ان کی عملی قوتوں کو بیش از بیش مضمحل کرتا گیا۔ ان کی وحدتِ اخوت کا سلسلہ مزید بکھرتا چلا گیا اور وحدتِ فکر و عمل سے یہ محرومی ان کی بے بسی اور بے چارگی میں اضافہ کرتی چلی گئی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۵ء میں جب قائد اعظمؒ نے اس کی عنانِ قیادت اپنے ہاتھوں میں لی تو چاروں طرف مایوسی اور شکست، انتشار اور اضطراب کا اندوہناک سماں طاری تھا۔

مایوسی اور بے چارگی کے مرگ آفریں مرحلہ میں اگر قائد اعظمؒ کی قیادت آڑے نہ آتی تو ہندو قوم پورے برصغیر پر اپنا تسلط جما چکی ہوتی اور اس کی غلامی و محکومی میں مسلمانوں کا جو حشر ہوتا اس کا اندازہ اس صورتِ حال سے بخوبی لگایا جا سکے گا جو سنہ ۱۹۳۷ء کے صوبائی انتخابات کے بعد ہندو اکثریت کے صوبوں میں منظرِ عام پر آئی اور تقسیم ہند کے بعد اب پورے بھارت میں اس کی بھیانک تصویریں قدم قدم پر دکھائی دے رہی ہیں۔ قائد اعظمؒ کی سیرت و کردار کا یہ بہت بڑا معجزہ ہے کہ مسلم اکثریت کے علاقوں میں نہ صرف یہ کہ کروڑوں مسلمان اس صورتِ حال کا شکار بننے سے بچ گئے بلکہ وہ ان علاقوں میں ہندو کے بالمقابل اپنی آزاد اور خود مختار مملکت کے قیام کے بھی قابل ہو گئے۔ جو مملکت پاکستان کے نام سے وجود پذیر ہوئی اور اس کا وجود کروڑوں مسلمانوں کی مقدس امنگوں اور آرزوں کا مرکز و محور قرار پا گیا۔

تحریکِ پاکستان شایانِ شان قربانیوں سے حاصلِ مراد کو پہنچی۔ مملکتِ پاکستان کا وجود عمل میں آیا اور ملتِ پاکستان کو یہ کلی اختیار حاصل ہو گیا کہ جس انداز سے بھی چاہے اس مملکت کی تعمیر کا فریضہ سرانجام دے اس حقیقت میں کسی کو کلام نہیں لیکن اس حقیقت کے پہلو بہ پہلو ایک اور تلخ حقیقت بھی پہلے دن سے برابر مخالفت کے ایک گھناؤنے کردار کی آئینہ دار بنی چلی آ رہی ہے۔ یہ سلسلۂ مخالفت ان مفاد پرست عناصر کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ جو پہلے تحریکِ پاکستان کے خلاف بڑے مقدس حربوں اور روباہ بازیوں سے کام لیتے رہے۔ اور جب پاکستان ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آ گیا تو اعترافِ شکست کے بجائے اپنی اسی مذموم ذہنیت کے تحت اس مملکت کے امن و سلامتی اور اقتدار و استحکام کے خلاف شکوک و شبہات اور بے یقینی و انتشار کے خرابے بکھیرتے چلے آئے۔ یہی وہ عناصر ہیں جنکی فتنہ انگیزیوں سے اس مملکت کی حفاظت نہ صرف اس مملکت کے کارفرماؤں کی ذمہ داری ہے بلکہ ہر مخلص اور سچے پاکستانی کا فریضہ بھی۔

تحریکِ پاکستان اور مملکتِ پاکستان کے خلاف اس مفاد پرست اور تخریبی ذہنیت کی داستان ہمارے سامنے صاحبِ حزبِ کلیم علیہ السلام اور قومِ بنی اسرائیل کے اس سلسلۂ کشمکش کو لے آتی ہے جو قرآن کریم کے اوراق میں عبرت و موعظت کے ایک اہم واقعہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کی یہ داستان بعینہٖ اس صورت حال پر منطبق نظر آئے گی جو تحریکِ پاکستان کے آغاز سے اب تک ہمارے ہاں رونما چلی آ رہی ہے۔ یہ داستان بتاتی ہے کہ ہمارے ہاں کے مفاد پرست عناصر اور تخریبی ذہن کی روباہ بازیاں تاریخ کا کوئی نیا اور انوکھا ورق نہیں بلکہ اس سے پہلے بھی تاریخ کے مختلف مراحل میں ایسا ہوتا رہا ہے۔ صاحبِ حزبِ کلیمؑ جب بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلانے اور وہاں سے انہیں آزاد فضاؤں میں لے جانے کے لئے میدان میں آئے تو اس حقیقت کے باوجود کہ اس قوم کو صدیوں کے بعد رستگاری نصیب ہو رہی تھی اور ان کی غلامی و محکومی کی زنجیریں توڑ کر انہیں آزادی و استقلال کی روشن فضاؤں میں آباد کرنا مقصود تھا، اسی قوم سے، مفاد پرست اور تخریب پسند ذہن ابھر ابھر کر خدا کے اس جلیل القدر نبیؑ کی راہ میں کانٹے بکھیرتا رہا اور جب ان کا یہ جلیل القدر نجات دہندہ کچھ مدت کے لئے انہیں چھوڑ کر باہر چلا گیا تو ہر قسم کے عہد و پیمان کے باوجود ان کی خوئے غلامی اپنے لئے گوسالہ پرستی کے شاخسانے ایجاد کرتی رہی۔ اپنے محسنِ جلیل کے احسانات کا سپاس گزار بننے کے بجائے وہ مسلسل اس کے لئے تکلیفوں اور پریشانیوں کا سلسلہ قائم کئے رہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی مسلسل جدوجہد بالآخر اس صورت حال پر قابو پانے اور ابھرتی ہوئی نئی نسل کو اس گھناؤنی ذہنیت سے نجات دلانے میں کامیاب ہو گئی لیکن ہمارے ہاں اس کا روشن امکان اس لئے پیدا نہ ہو سکا کہ قیامِ پاکستان کے جلد ہی بعد بانیٔ مملکت کی پُر اثر شخصیت ہمارے درمیان موجود نہ رہی اور ان کے سانحۂ رحلت کے بعد اُن

کے جانشین اس ذہنیت سے نمٹنے کے بجائے کشمکشِ اقتدار میں کھو گئے۔ اور یہ ذہنیت پروان چڑھتی، پھولتی پھلتی اور وبالِ جان بنتی چلی گئی۔

جیسا کہ ہم نے گزشتہ سطور میں قوم بنی اسرائیل کی داستان سے بتایا ہے۔ مفاد پرستیوں اور تخریب پسندیوں کے یہ کھیل جو ہمارے ہاں مملکت کے بقاء و استحکام کے خلاف کھیلے جا رہے ہیں کسی نئی اور انوکھی ذہنیت کے آئینہ دار نہیں۔ بلکہ عروج و اقبال اور آزادی و استقلال کی منزل پر بڑھتی ہوئی کم و بیش ہر قوم کو ایسے عناصر سے واسطہ پڑتا رہا اور جہاں قوتِ فیصلہ کی مضبوطی اور کارفرمایانِ مملکت کا عزم و یقین ملک و ملت کو ان عناصر سے نجات دلانے پر تُل گیا۔ وہاں یہ عناصر اپنی موت مر گئے اور کاروانِ ملت کی راہیں ان کانٹوں سے صاف ہو گئیں۔ لیکن یاد رکھئے کہ معاملہ اسی پر ختم نہیں ہوتا۔ تخریبی قوتوں کا استیصال ہماری ذمہ داریوں کا صرف ایک پہلو ہے۔ یہ لا کی منزلِ اوّلین ہے۔ جس کے بعد لازماً اِلّا کا تعمیری مرحلہ سامنے آتا ہے۔ یعنی منفی اثرات کی تطہیر کے بعد یہاں حقیقی تعمیر کا فریضہ ادا کرنا ہوگا۔ ہم نے یہ خطۂ زمین اس لئے حاصل کیا تھا کہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے بجائے یہاں دینِ خداوندی کی مستقل اقدار اور غیر متبدل قوانین کی کارفرمائی عمل میں آئے گی اور ان کی بدولت وہ معاشرہ متشکل ہو گا جس کی سدا بہار خوشگوار یاں پوری نوعِ انسانی کو اپنی آغوشِ رحمت میں لے لیں گی۔ اور اس طرح دینِ خداوندی کی جہانگیری اور عالم آرائی منشائے خداوندی کی تکمیل کا سامان بن جائے گی۔ نوعِ انسانی کی وہ زنجیریں ٹوٹ جائیں گی۔ اور اُسے ان بندھنوں سے نجات مل جائیگی۔ جو خون، وطن، رنگ، نسل اور نیشنلزم کے نام پر اس کے نشو و ارتقاء پر بیسیوں قدغن لگائے ہوئے ہیں۔

یہ درست ہے کہ ہمارے آئین میں یہ شق شامل ہے کہ اسلام کے خلاف یہاں کوئی قانون رائج نہیں ہو گا۔ لیکن ہماری بدقسمتی سے اسلام آج ایسے لفظ کی صورت پا گیا ہے جس کا کوئی بھی متعین مفہوم مسلمانوں کے سامنے باقی نہیں رہا۔ آج ہر فرقے کا اسلام دوسرے فرقے سے مختلف ہے۔ اور انسانی ذہن کی مفاد پرستیوں نے اس میں ایسی ایسی چیزیں شامل کر دی ہیں جو منشائے دین کے قطعاً منافی ہیں۔ اور اب وہ جزوِ دین بن کر عین اسلام قرار پا گئی ہیں۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ہمارے پاس قرآن کریم خدا کی وہ آخری کتاب ہے جس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے۔ اور جس کے ایک ایک لفظ پر ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ یہ بعینہٖ وہی ہے جو حضور نبی اکرمؐ کی وساطت سے نوعِ انسان کو عطا کی گئی۔ ایسی صورت میں سیدھی اور صاف راہ یہی ہے کہ ملتِ پاکستان کو ہر قسم کی الجھنوں سے محفوظ رکھنے اور حقیقی معنوں میں یہاں اسلامی نظام کے قیام کے لئے یہ اعلان کر دیا جائے کہ یہاں قرآن کریم کے غیر متبدل اصول و قوانین کو عملاً متشکل کیا جائے گا اور ان اصول و قوانین کے خلاف کوئی دوسرا قانون رائج نہیں ہو گا۔

یہی کچھ بانیٔ پاکستان نے اپنے وضاحتی اعلانات میں ارشاد فرمایا تھا۔ اور یہی ہماری مشکلات اور الجھنوں کا قطعی اور یقینی حل ہے۔

ہمیں توقع کرنی چاہیئے کہ ہماری مملکت کے کارفرما ملک و ملت کو سالہا سال کی پیدا شدہ الجھنوں اور پریشانیوں سے نجات دلانے کے لئے پوری جرأت سے اُلّٰی کی اس منزل کو اختیار کریں گے۔ اور اس طرح پاکستان میں دینِ خداوندی کے منشاء و مقصود کے مطابق ایک ایسا معاشرہ متشکل کرنے کے قابل ہو سکیں گے جو تحریک پاکستان کا حقیقی نصب العین اور بانیٔ پاکستان کے فاتحانہ عزائم کا محور تھا۔ قائداعظمؒ کا یوم ولادت اسی منزلِ مقصود کی نشان دہی کرتا ہے اور اسی منزلِ مراد کا حصول دینِ خداوندی کی عالم آرائی کا واحد ذریعہ ہے۔

سابقہ سطور میں ہم نے یہ عرض کیا تھا کہ ہمارے ہاں اب اسلام کا کوئی متعین مفہوم مسلمانوں کے ذہنوں میں موجود نہیں رہا۔ مسلمانوں کے مختلف فرقے اسلام کے بارے میں ایک دوسرے سے مختلف مفہوم و تصورات رکھتے ہیں۔ معاملاتِ زندگی میں یہ اختلافات ایسی صورت اختیار کر گئے ہیں کہ ایک چیز جو ایک فرقے کے نزدیک عین اسلام ہے وہ دوسروں کے نزدیک کفر و شرک کا درجہ رکھتی ہے۔ ان اختلافات کے باوجود جو صدیوں سے کارفرما چلے آ رہے ہیں ایک کتاب ایسی بھی ہے جو ہر مسلمان کے نزدیک اختلافات سے منزہ اور بالاتر قرار پا چکی ہے۔ یہ کتاب، خدا کی آخری کتاب یعنی قرآن کریم ہے۔ جس کے متعلق سب کا ایمان یہ ہے کہ یہ حرفاً حرفاً وہی ہے جو حضور نبی اکرمؐ کے ذریعہ خدا کی بارگاہ سے عطا ہوئی۔ قائداعظمؒ کے نزدیک خدا کی یہی کتاب اسلامی حکومت کی کارفرمائی کا مرکز و محور بن سکتی ہے۔ اور نظامِ حکومت میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہ سکتا۔

قائداعظمؒ پاکستان میں کس قسم کا نظام چاہتے تھے؟ ان کے ذہن میں پاکستان کے نظام مملکت کا جو خاکہ ترتیب پا رہا تھا اس کے خدوخال کیا تھے؟ بالفاظ دیگر اسلامی نظام کا وہ کون سا تصور تھا جو اس جدوجہد میں ان کے قلب و نگاہ کا محور تھا؟ اس موقع پر اس کی وضاحت کو، خود ان کے اپنے ارشادات کی روشنی میں پیش کرنا ضروری دکھائی دیتا ہے۔ آیئے اب یہ دیکھیں کہ انہوں نے مختلف مواقع پر اس بارے میں کیا کچھ ارشاد فرمایا۔

۱۹۳۷ء میں قائداعظمؒ کے زیر صدارت آل انڈیا مسلم لیگ کا پہلا نمائندہ اور تاریخی اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ یہی وہ قومی دربار تھا جس میں پنجاب، بنگال اور آسام کے وزرائے عظام اپنے رفقاء سمیت شریک ہوئے اور اپنی خدمات مسلم لیگ اور قائداعظمؒ کے سپرد کر دیں۔ اسی تاریخی اجتماع کے خطبۂ صدارت میں قائداعظمؒ نے فرمایا :-

"مسلمان اگر اپنی کھوئی ہوئی قوتوں کو ازسرِنو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس وقت صرف ایک ہی چیز یہ سہارا مہیا کر سکتی ہے اور وہ یہ کہ مسلمان اپنے کھوئے ہوئے یقین کو دوبارہ حاصل کریں اور اسی محکم

اور بلند تصورِ حیات کا سہارا لے کر اٹھیں جو ان کی عالمگیر قومی وحدت کا جزو لاینفک ہے۔ اور جو انہیں ایک سیاسی وحدت میں منسلک کرنے کا باعث ہو گا۔

(مسئلہ دستورِ ہند ۔۔ از نوابزادہ لیاقت علی خان)

کراچی کے مسلم لیگ سیشن میں انہوں نے اس کی مزید وضاحت فرمائی اور وہ یہ کہ جب ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ایک جداگانہ قوم ہیں اور ایک مخصوص تصورِ حیات رکھتے ہیں تو اس کا مطلب کیا ہے؟ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں پہلے خود ہی یہ سوال کیا کہ

وہ کون سی چیز ہے جس نے مسلمانوں کو ایک رشتے میں منسلک کر رکھا ہے، وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی عمارتِ ملّی کی بنیاد ہے؟ وہ کون سا لنگر ہے جس سے ان کی کشتی بندھ رہی ہے؟

اور پھر خود ہی اس کے جواب میں اس عظیم حقیقت کا اعلان کیا کہ

ان سوالوں کا جواب ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ یہ محکم رشتہ، یہ سنگین چٹان، یہ آہنی لنگر، وہ کتابِ عظیم (قرآن) ہے جس نے تمام مسلمانوں کو جسدِ واحد بنا رکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم جوں جوں آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں وحدت زیادہ ہوتی جائے گی۔ اس لئے کہ ہمارا خدا ایک، خدا کی کتاب ایک، اس کا رسول ایک۔ اس لئے ہماری ملّت بھی ایک ہے۔

(SPEECHES AND WRITINGS OF MR. JINNAH, VOL II P.80)

۱۹ / اگست سنہ ۱۹۴۱ء کو قائداعظم ؒ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد (دکن) میں تشریف لے گئے۔ اس موقع پر یونیورسٹی کے طلبا نے قائداعظم ؒ سے جو اہم سوالات کئے اور قائداعظم نے جو جواب دیئے اس کی تفصیل اورینٹ پریس کی وساطت سے اخبارات میں شائع ہوئی۔ قائداعظم ؒ سے سوال کیا گیا کہ

آپ کے نزدیک اسلامی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

اور قائداعظم ؒ نے اس کا جو بصیرت افروز جواب دیا وہ یہ تھا کہ

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے اصول اور احکام ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں، قرآنی اصولوں اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

قائدِ اعظمؒ کی یہ وضاحت، پاکستان کے نظامِ مملکت کے بارے میں نشانِ منزل کی حیثیت رکھتی ہے اور اس نشانِ منزل کو اپنائے بغیر ہمارا بھٹکتا ہوا کارواں کبھی منزلِ مراد کا رُخ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۴۵ء میں انہوں نے اپنے پیغامِ عید میں فرمایا تھا کہ

اس حقیقت سے ہر مسلمان باخبر ہے کہ قرآن کے قوانین صرف مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ گبن نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ بحرِ اطلانطک سے لے گنگا تک ہر جگہ قرآن کو ضابطۂ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے۔ جس کا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں۔ بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے۔ جس کے قوانین نوعِ انسان کے تمام احوال و اعمال کو محیط ہیں اور وہ منشائے خداوندی کے مظہر ہیں۔

اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ضابطۂ حیات ہے مذہب، معاشرت، تجارت، عدالت، فوج، سول اور فوجداری کے تمام قوانین کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں، یا روزمرہ کی زندگی کے عام معاملات، روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا۔ اجتماعی واجبات کا مسئلہ ہو یا انفرادی حقوق کا۔ اخلاقیات کا معاملہ ہو یا جرائم کا۔ اس دنیا میں مجرموں کی سزا کا سوال ہو یا آخرت کی عقوبت کا۔ ان تمام معاملات کے لئے اس ضابطہ میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی کریمؐ نے فرمایا تھا کہ ہر مسلمان کو قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھنا چاہیئے۔

(SPEECH AND WRITINGS OF MR. JINNAH VOL. II, P. 405)

یہ تھا وہ مقصدِ جلیل جس کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا اور اس سے صاف واضح ہے کہ جب تک ہم مملکت کے نظام اور اپنی زندگیوں کو قرآن کریم کے عطا فرمودہ قوانین کے سانچے میں نہیں ڈھالیں گے حصولِ پاکستان کا مقدس مشن پورا نہیں ہوگا۔

مُستقل خریدار توجہ فرمائیں

جس ماہ آپ کا چندہ ختم ہو جاتا ہے اسی ماہ کے پرچے کے ساتھ ایک کارڈ منسلک کر دیا جاتا ہے آپ فوراً اس کارڈ کو غیر ضروری شقیں کاٹنے کے بعد بغیر ٹکٹ لگائے پوسٹ کر دیں۔ اگر کسی کا چندہ یا کارڈ دفتر میں موصول نہیں ہوتا تو ہم آئندہ سال کے چندہ کی وصولی کے بعد انہیں وی۔ پی بھیج دیتے ہیں اس وی۔ پی کا چھڑانا آپ کا اخلاقی فریضہ ہے۔ منی آرڈر کے کوپن اور ادارہ کو لکھے جانے والے خطوط میں اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔ (ناظم ادارہ)

باسمہٖ تعالیٰ

مولانا مودودی
اور
جمہوریت

شائع کردہ:- ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا مودودی اور جمہوریت

"صحیح حکمتِ عملی یہ نہیں کہ پہلے سے متعین کر لیا جائے کہ تجھے کیا کرنا ہے۔ حکمتِ عملی یہ ہے کہ حسبِ موقع جو صورت اپنے فائدے کی نظر آئے اسے اختیار کر لیا جائے۔"

یہ الفاظ ہیں اٹلی کے مشہور مدبر میکیاوَلی کے، جسے عصرِ حاضر کی مغربی سیاست کا امام تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ایک اور سیاست بھی ہے جس کے منشور میں کہا گیا ہے ؎

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ - (۶/۱۱۶)۔

تیرے رب کی بات سچائی اور عدل کے ساتھ تکمیل تک پہنچ گئی اب ان باتوں کو بدلنے والا کوئی نہیں۔

یہ اسلام کی سیاست ہے جس کے اصول وقتی مصلحتوں کے تحت بدلتے نہیں۔ وہ ہمیشہ اٹل اور غیر متبدل رہتے ہیں۔ جماعتِ اسلامی کے امیر سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کا دعوٰے یہ ہے کہ وہ مغرب کی ابلیسی سیاست کے بجائے اسلامی سیاست کے علمبردار ہیں اور اسی سیاست کو مملکتِ پاکستان میں قائم کرنا ان کا اور ان کی جماعت کا مشن ہے۔ ہم دیکھنا یہ چاہتے ہیں کہ ان کا یہ دعویٰ کس حد تک صداقت پر مبنی ہے۔ کیا وہ اسلامی سیاست کے نقیب ہیں یا مغرب کی میکیاوَلی سیاست کے علمبردار، جس کے اصول ہر مصلحت کے ساتھ بدلتے چلے جاتے ہیں۔ اس نشست میں ہم ان کی بساطِ سیاست کے صرف ایک گوشے کو سامنے لانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے آج کل ایک مہم شروع کر رکھی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ

نئی مہم | (۱) ملک کے ہر بالغ کو رائے دینے کا حق دیا جائے — اور

(۲) ملک میں جمہوری نظام قائم کیا جائے۔

شق نمبر ۱ سے مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کا محض بالغ ہو جانا اُسے اس کا حقدار بنا دیتا ہے کہ وہ ملک کے سیاسی معاملات میں اپنی رائے دے سکے۔ اور شق نمبر ۲ کے معنی یہ ہیں کہ اس قسم کے ووٹروں کی کثرتِ رائے سے جو لوگ پارلیمان کے ممبر

منتخب ہوں انہیں قوم کا نمائندہ سمجھا جائے۔ اور جو فیصلے ان کی اکثریت کرے وہ ملک کا قانون بن جائیں۔ مودودی صاحب کا کہنا یہ ہے کہ اس طریق سے ملک کا نظام اسلامی ہو جائے گا۔ وہ اس سلوگن کو بار بار دہرائے چلے جاتے ہیں کہ اسلام اور جمہوریت لازم ملزوم ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے نزدیک جمہوریت اسلام کا غیر متبدل اصول ہے۔ اور اس کے خلاف ہر تصور غیر اسلامی ہے۔ ہم دیکھنا یہ چاہتے ہیں کہ اسی جمہوریت کے متعلق مودودی صاحب اس سے پہلے کیا کہا کرتے تھے۔

واضح رہے کہ اس وقت ہم نہ اس بحث کو چھیڑنا چاہتے ہیں کہ جمہوری نظام کے معنی کیا ہیں، اسلام سے اس کا تعلق کیا ہے، اور صحیح اسلامی نظام کہتے کسے ہیں؟ ہم اس وقت صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مودودی صاحب آج جس چیز کو عین اسلام قرار دے کر عالمگیر مہم چلا رہے ہیں وہ اس کے متعلق ابھی کل تک کیا فرمایا کرتے تھے؟

تحریک پاکستان کے دوران میں صورت حال یہ تھی کہ قائد اعظمؒ کی قیادت میں مسلم لیگ کا مطالبہ یہ تھا کہ ہندوستان کے جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے انہیں ہندوستان سے الگ کر دیا جائے تاکہ وہاں مسلمان اپنے نظریۂ زندگی کے مطابق اسلامی انداز کی حکومت قائم کرنے کے قابل ہو سکیں۔ ہندوؤں کی کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو مسلم لیگ سے الگ کر کے دنیا پر اس حقیقت کو واضح کر دیا جائے کہ مسلمانوں کی اکثریت اس مطالبہ کے ہمنوا نہیں۔ انہیں اس مذموم کوشش میں ناکامی ہوئی اور مسلمانوں کی بہت بھاری اکثریت اس مطالبہ کی تائید کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ مودودی صاحب آگے بڑھے اور انہوں نے ہندوؤں سے کہا کہ تم اس صورت حالات سے گھبراؤ نہیں۔ اگر مسلمانوں کی اکثریت اس مطالبہ کے ہمنوا ہے تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں ابھی یہ واضح کئے دیتا ہوں کہ ان مسلمانوں کی حیثیت کیا ہے اور اسلام کی رُو سے اس دعویٰ کی حقیقت کیا کہ اکثریت کا مطالبہ بالضرور مان لینے کے قابل ہوتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے وہاں اپنی اس مہم کو جاری کیا کہ اکثریت کا فیصلہ کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ ذرا غور سے سنئے کہ وہ اس بارے میں کیا کہتے تھے اور اس طرح ہندوؤں کو وہ کس طرح تقویت پہنچاتے چلے جا رہے تھے۔ انہوں نے اپنے سلسلۂ مضامین بہ عنوان "سیاسی کشمکش" میں لکھا[1]۔

> **مسلم اکثریت پر حملہ** ایک قوم کے تمام افراد کو محض اس وجہ سے کہ وہ نسلاً مسلمان ہیں، حقیقی معنی میں مسلمان فرض کر لینا اور یہ امید رکھنا کہ ان کے اجتماع سے جو کام بھی ہوگا اسلامی اصول ہی پر ہوگا پہلی اور بنیادی غلطی ہے۔ یہ انبوہ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں، نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔ نہ ان کا

---

[1] یہ مضامین بعد میں مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش کے عنوان سے تین حصوں میں شائع کئے گئے تھے۔

اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آ رہا ہے اس لئے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انہوں نے حق کو حق جان کر قبول کیا ہے نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ ان کی کثرت رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابل داد ہے۔

(ترجمان القرآن محرم ۱۳۶۰ھ صفحہ ۳۷)

اس کے بعد انہوں نے یہ لکھا کہ مسلم لیگ والے جو یہ کہتے ہیں کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گی وہاں ہم اسلامی انداز کی حکومت قائم کرنے کے قابل ہو سکیں گے، بہت بڑے فریب پر مبنی ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

اسلامی نصب العین ناممکن ہو گا

اس کے بعد اس طریقہ کا جائزہ لیجئے جس سے یہ بزعم خود اسلامی نصب العین تک پہنچنے کی امید رکھتے ہیں۔ ان کی تجویز یہ ہے کہ پہلے اسی جمہوری دستور کے مطابق جو انگریزی حکومت یہاں نافذ کرنا چاہتی ہے، مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کی اپنی حکومت قائم ہو جائے، پھر کوشش کی جائے گی کہ یہ قومی حکومت اسلامی نظام حکومت میں بتدریج تبدیل ہو جائے۔ لیکن یہ ویسی ہی غلطی ہے جیسی آزادیٔ ہند کو مقدم رکھنے والے حضرات کر رہے ہیں۔ ان کی تجویز پر جو اعتراضات ہیں بعینہٖ وہی اعتراضات ان کی تجویز پر بھی ہیں۔ ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں حکومت جمہور کے اصول پر خود مختار حکومت کا قیام آخر کار حاکمیت رب العالمین کے قیام میں مددگار ہو سکتا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۴۰)

سلہ اس موقع پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمح نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے۔ برعکس اس کے ان کی طرف سے بصراحت اور بتکرار جس چیز کا اظہار کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے پیش نظر محض ایک ایسی جمہوری حکومت ہے جس میں دوسری غیر مسلم قومیں بھی حصہ دار ہوں مگر اکثریت کے حق کی بنا پر مسلمانوں کا حصہ غالب ہو۔ بالفاظ دیگر ان کو مطمئن کرنے کے لئے صرف اتنی بات کافی ہے کہ ہندو اکثریت کے تسلط سے وہ صوبے آزاد ہو جائیں جن میں مسلمانوں کی کثرت ہے باقی رہا نظام حکومت تو وہ پاکستان میں بھی ویسا ہی ہوگا جیسا ہندوستان میں ہوگا۔ ان کے اس نصب العین پر جب یہ اعتراض کیا گیا کہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت اسلامی نقطۂ نظر سے غیر مسلموں کی کافرانہ حکومت کے مقابلہ میں کچھ بھی قابل ترجیح نہیں ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ قابل لعنت ہے تو ذمہ دار لیڈروں میں سے تو کسی نے اس کا جواب نہ دیا، البتہ جو لوگ پاکستانی حلقوں کی صف آخر میں شمار ہوتے ہیں اور جن کی کوئی ذمہ دار حیثیت نہیں ہے انہوں نے کہنا شروع کیا کہ مسلم اکثریت کو جب خود اختیاری حاصل ہو جائے گی تب ہم نظام حکومت کو بدلنے کی کوشش کریں گے۔"

(ایضاً صفحہ ۴۱)

اس کے نیچے انہوں نے فٹ نوٹ میں لکھا تھا کہ "پاکستان میں مسلمانوں کی کافرانہ حکومت اسلامی نقطۂ نظر سے غیر مسلموں کی کافرانہ حکومت کے مقابلے میں کچھ بھی قابلِ ترجیح نہیں ہو گی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت (ہو گی)"۔

مسلم سوسائٹی یا چڑیا گھر وہ ان مسلمانوں کو نا مسلم ہی نہیں بلکہ جانور سمجھتے تھے۔ ان کے الفاظ یہ تھے۔

غرض آپ اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کا جائزہ لیں گے تو اس میں آپ کو بھانت بھانت کا مسلمان نظر آئے گا۔ مسلمان کی اتنی قسمیں ملیں گی کہ آپ شمار نہ کر سکیں گے۔ یہ ایک چڑیا گھر ہے جس میں چیل۔ کوّے۔ گدھ۔ بٹیر۔ تیتر اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک "چڑیا" ہے کیونکہ چڑیا گھر میں داخل ہے۔ (ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ سنہ ۱۳۵۹ھ صفحہ ۲۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے کہ میری امت کا سوادِ اعظم کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہو گا۔ تم اس کا ساتھ دو۔ جب کسی نے مودودی صاحب کی توجہ اس حدیث کی طرف منعطف کرائی تو انہوں نے جواب میں کہا۔

سوادِ اعظم کا مفہوم بعض لوگ اس دھوکے میں مبتلا ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت کا نام "سوادِ اعظم" ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے کہ "سوادِ اعظم" کا ہمیشہ ساتھ دو۔ لہٰذا مسلمانوں کی اکثریت جس سیاسی پارٹی کی حامی اور جس قیادت کی متبع ہے اس کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔ لیکن یہ ارشادِ نبوی کی سراسر غلط تعبیر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس سوادِ اعظم کے ساتھ رہنے کا حکم دیا ہے اس سے مراد دراصل ان مسلمانوں کی اکثریت ہے جن کے اندر اسلامی شعور موجود ہو۔ جو حق اور باطل کی تمیز رکھتے ہوں اور جن کو اسلام کی روح اور اس کے بنیادی اصولوں سے کم از کم اتنی واقفیت ہو کہ اسلام اور غیر اسلام میں فرق کر سکتے ہوں۔ ایسے مسلمانوں کی اکثریت کبھی باطل پر مجتمع نہیں ہو سکتی۔ اور اگر وہ کبھی کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو بھی جائے تو اس پر زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ اس بنا پر حضورؐ نے سوادِ اعظم کا ساتھ دینے کی تاکید فرمائی ہے مگر جو لوگ ان ضروری صفات سے عاری ہیں اور جن میں کھرے اور کھوٹے کی بالکل ابتدائی پرکھ بھی نہ ہو ان کے ہلڑ کا نام ہرگز اسلامی سوادِ اعظم نہیں ہے۔ نہ ان کی جماعت اسلامی مفہوم کے اعتبار سے جماعت ہے نہ ان کی امارت اسلامی اصطلاح کی رُو سے امارت ہے نہ ان کی اس امارت کو کسی حیثیت سے سمع و طاعت کا حق پہنچتا ہے محض لفظ مسلمان سے دھوکا کھا کر جو لوگ جاہلیت کی پیروی کرنے والوں کی تنظیم کو تنظیم سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس نوعیت کی کوئی تنظیم اسلامی نقطۂ نظر سے مفید ثابت ہو گی ان کی کند ذہنی ماتم کی مستحق ہے۔ (ترجمان القرآن بابت ذی الحجہ سنہ ۱۳۵۹ھ صفحہ ۲۷)

محض مردم شماری کے رجسٹروں میں

اسی رسالے میں انہوں نے لکھا۔

"ان وجوہ سے وہ عظیم الشان تعداد جو ہم کو مردم شماری کے رجسٹروں میں نظر آتی ہے "اسلامی اغراض کے لئے قریب قریب بالکل بیکار ہو چکی ہے۔ اس تعداد کے بھروسہ پر اگر کچھ کیا جائے گا تو سخت مایوسی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ جو امید وابستہ کی جا سکتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اگر اسلام ازسرنو ایک زندہ تحریک کی حیثیت سے اٹھے اور شیطانی قوتوں کے مقابلہ میں اپنے اصول کی حکمرانی و فرماں روائی قائم کرنے کے لئے برد آزما ہو تو شاید غیر مسلموں کی بہ نسبت ان مسلمانوں میں سے اس کو کچھ زیادہ دلیٹر نسبتاً زیادہ آسانی کے ساتھ مل سکیں گے"۔

(ایضاً صفحہ ۵)

اس قسم کے مسلمانوں کی آراء سے جس قسم کے ممبر منتخب ہوں گے اور یہ ممبر جس قسم کی حکومت قائم کر سکیں گے اس کے متعلق انہوں نے کہا۔

مسلم اکثریت کی کافرانہ حکومت

جہاں ایسے لوگوں کی اکثریت ہو وہاں کبھی یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ عام انتخاب میں ان کے ووٹوں سے وہ صالحین منتخب ہوں گے جو منہاج نبوت پر حکومت کرنے والے ہوں۔ جمہوری انتخاب کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے دودھ کو بلو کر مکھن نکالا جاتا ہے۔ اگر دودھ زہریلا ہو تو اس سے جو مکھن نکلے گا قدرتی بات ہے کہ وہ دودھ سے زیادہ زہریلا ہوگا۔ اسی طرح اگر سوسائٹی بگڑی ہوئی ہو تو اس کے ووٹوں سے وہی لوگ منتخب ہو کر برسر اقتدار آئیں گے جو اس سوسائٹی کی خواہشات نفس سے سند قبولیت حاصل کر سکیں گے۔ پس جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الٰہی قائم ہو جائے گی ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے [illegible] وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ اس کا نام حکومت الٰہی رکھنا اس پاک نام کو ذلیل کرنا ہے"۔

(ترجمان القرآن محرم ۱۳۶۱ھ صفحہ ۲۹)

آپ نے غور فرمایا کہ اس وقت مودودی صاحب جمہوری نظام کے متعلق کیا فرماتے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی" اور ملتہ اسی پرچے میں آگے چل کر وہ لکھتے ہیں۔

جمہوری اسٹیٹ اسلام کے منافی ہوگا

اب میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جو قومی اسٹیٹ جمہوری طرز پر تعمیر ہوگا وہ اس بنیادی اصلاح میں آخر کس طرح مددگار ہو سکتا ہے جمہوری حکومت میں اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں آتا ہے جن کو ووٹروں

کی پسندیدگی حاصل ہو۔ دونوں میں اگر اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر نہیں ہے، اگر وہ صحیح اسلامی کیریکٹر کے حامل نہیں ہیں، اگر وہ اس بے لاگ عدل اور ان بے لچک اصولوں کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں جن پر اسلامی حکومت چلائی جاتی ہے تو ان کے ووٹوں سے کبھی "مسلمان" قسم کے آدمی منتخب ہو کر پارلیمنٹ یا اسمبلی میں نہیں آسکتے۔ اس ذریعہ سے تو اقتدار انہی لوگوں کو ملے گا جو مردم شماری کے رجسٹر میں چاہے مسلمان ہوں مگر اپنے نظریات اور طریق کار کے اعتبار سے جن کو اسلام کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔" (ایضاً صفحہ)

وہ ان مسلمانوں کے متعلق جن کے جمہوری نظام سے پاکستان میں آزاد حکومت قائم ہونی تھی کہتے تھے۔

کافر ٹائپ مسلمان "یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے، کیریکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دینے والے جس قدر کافر قومیں فراہم کرتی ہیں غالباً اسی تناسب سے یہ بھی فراہم کرتی ہے۔ رشوت، چوری، زنا، جھوٹ، اور دوسرے تمام ذمائم اخلاق میں یہ کفار سے کچھ کم نہیں ہے۔ پیٹ بھرنے اور دولت کمانے کے لئے جو تدبیریں کفار کرتے ہیں وہی اس قوم کے لوگ بھی کرتے ہیں۔ ایک مسلمان وکیل جان بوجھ کر حق کے خلاف اپنے موکل کی پیروی کرتے ہوئے اتنا ہی خدا کے خوف سے خالی ہوتا ہے جتنا ایک غیر مسلم وکیل ہوتا ہے۔ ایک مسلمان رئیس دولت پاکر یا ایک مسلمان عہدہ دار حکومت پاکر وہی سب کچھ کرتا ہے جو غیر مسلم کرتا ہے۔ یہ اخلاقی حالت جس قوم کی ہو اس کی تمام کالی اور سفید بھیڑوں کو جمع کر کے ایک منظم گلہ بنا دینا اور سیاسی تربیت سے ان کو لومڑی کی ہوشیاری سکھانا یا فوجی تربیت سے ان میں بھیڑیئے کی درندگی پیدا کرنا، جنگل کی فرمانروائی حاصل کرنے کے لئے تو مفید ہو سکتا ہے۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ اس سے اعلائے کلمۃ اللہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ کون ان کی اخلاقی برتری تسلیم کرے گا۔ کس کی نگاہیں اس کے سامنے عزت سے جھکیں گی۔ کس کے دل میں انہیں دیکھ کر اسلام کے لئے احترام کا جذبہ پیدا ہوگا؟ کہاں ان کے "انفاس قدسیہ" سے یدخلون فی دین اللہ افواجا کا منظر دکھائی دے سکے گا۔ کس جگہ ان کی روحانی امامت کا سکہ جمے گا۔ اور زمین پر بسنے والے کہاں ان کا خیر مقدم اپنے نجات دہندوں کی حیثیت سے کریں گے؟ اعلائے کلمۃ اللہ جس چیز کا نام ہے اس کے لئے تو صرف ان کارکنوں کی ضرورت ہے جو خدا سے ڈرنے والے اور خدا کے قانون پر نفع و نقصان کی پروا کئے بغیر جمنے والے ہوں۔ خواہ وہ اس نسلی مسلمان قوم میں سے

ملیں یا کسی دوسری قوم سے بھرتی ہو کر آئیں۔ ایسے دس آدمی اس مقصد کے لئے زیادہ قیمتی ہیں بہ نسبت اس کے کہ وہ انبوہ جس کا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں، ۲۵ لاکھ یا پچاس لاکھ کی تعداد میں بھرتی ہو جائے اسلام کو تانبے کے ان سکوں کا خزانہ مطلوب نہیں ہے جن پر اشرفی کا ٹھپہ لگایا گیا ہو۔ وہ سکّے کے نقوش دیکھنے سے پہلے یہ دریافت کرتا ہے کہ ان نقوش کے نیچے خالص سونے کا جوہر بھی ہے یا نہیں۔ ایسا سکہ ان جعلی اشرفیوں کے ڈھیر سے اس کے نزدیک زیادہ قیمتی ہے۔ (ایضاً ص)

وہ برملا کہتے تھے کہ "کثرت وقلت" کا سوال بہت بڑا مغالطہ ہے۔ اس لئے کہ

کثرت وقلت مغالطہ ہے

جو جماعتیں کسی طاقتور نظریہ اور جاندار اجتماعی فلسفہ کو لے کر اٹھتی ہیں وہ ہمیشہ قلیل التعداد ہی ہوتی ہیں اور قلت تعداد کے باوجود بڑی بڑی اکثریتوں پر حکومت کرتی ہیں۔ روسی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد اس وقت صرف ۳۲ لاکھ ہے اور انقلاب کے وقت اس سے بہت کم تھی مگر اس نے ۱۷ کروڑ انسانوں کو مسخر کر لیا۔ مسولینی کی فاشسٹ پارٹی صرف ۴ لاکھ ارکان پر مشتمل ہے اور روم پر مارچ کرتے وقت ۳ لاکھ تھی۔ مگر یہ قلیل تعداد ساڑھے چار کروڑ اطالوی باشندوں پر چھا گئی۔ یہی حال جرمنی کی نازی پارٹی کا ہے۔ اگر قدیم زمانے کی مثالیں خود اسلامی تاریخ سے دی جائیں تو ان کو یہ کہہ کر ٹالا جا سکتا ہے کہ وہ زمانہ گزر گیا اور وہ حالات بدل گئے۔ لیکن یہ تازہ مثالیں آپ کے اسی زمانہ کی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قلت آج بھی حکمران بن سکتی ہے بشرطیکہ وہ اسی طرح مجاہدہ کرے جس طرح ایک اصول اور ایک مسلک رکھنے والی جماعت کیا کرتی ہے۔ اور محدود اغراض کے لئے لڑنے کے بجائے ایسے اصولوں کے لئے لڑے جو لوگوں کی زندگی کے مسائل کو حل کرنے والے، دلوں اور دماغوں کو اپیل کرنے والے اور انسانی توجہات کو اس جماعت کی طرف کھینچنے والے ہوں۔

(ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ سنہ ۱۳۵۹ھ صفحہ ۳۸)

تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ تشکیلِ پاکستان سے پہلے مودودی صاحب کا اعلان یہ تھا کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے

(۱) موجودہ پیدائشی مسلمان بالکل بیکار ہیں۔

(۲) ان کی اکثریت کی آراء سے جو جمہوری نظام قائم ہوگا وہ کبھی اسلامی نہیں ہو سکتا۔

پاکستان وجود میں آگیا۔ اور وہی مسلمان جن کے متعلق مودودی صاحب کے ارشادات آپ ابھی ابھی دیکھ

چکے ہیں مگر اس خطۂ زمین میں آ کے تو مودودی صاحب نے ترجمان القرآن کے سب سے پہلے پرچے میں جو یہاں آ کر شائع ہوا تحریر فرمایا کہ

نئی قلابازیاں اس ملک کی اکثریت ایمانداری کے ساتھ یہ رائے رکھتی ہے کہ اسلام کے اصولوں کی پیروی میں پاکستان کے باشندوں کی فلاح ہے۔ اس کو یہ حق حاصل ہونا چاہیئے کہ ملک کا نظام اس کی رائے کے مطابق بنے۔ (ترجمان القرآن جون سنہ ۴۸ء صفحہ ...)

یہ جون سنہ ۱۹۴۸ء کا قصہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہی "مردم شماری کے رجسٹر کے پیدائشی مسلمان" تھے جن کے متعلق دا نگہ سے اس پار تک مودودی صاحب چلا چلا کر کہہ رہے تھے کہ یہ بے ایمان ہیں، منافق ہیں، بدکردار ہیں، ان کی کثرت رائے سے جو حکومت قائم ہوگی وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی بلکہ اس سے بھی بدتر۔ دنیا حیران تھی کہ انہی مسلمانوں کے متعلق اتنی جلدی مودودی صاحب کی رائے میں ایسا انقلاب کیوں آگیا، لیکن اس "کیوں" کا جواب تلاش کرنا کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔ مودودی صاحب نے پہلا داؤ یہ دکھایا کہ پاکستان کے مسلمانوں کی اکثریت یہاں اسلامی نظام قائم کرنا چاہتی ہے۔ اور اسلامی نظام اور کوئی قائم نہیں کر سکتا۔ اس لئے ملک کا اقتدار ہمارے حوالے کر دو۔ خود انہی حضرات کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے انہوں نے جولائی سنہ ۱۹۴۸ء میں تحریر فرمایا۔

مسلم عوام کے متعلق نئی رائے "اس وقت ہمارے سامنے ایک بہت بڑے کام کا پروگرام ہے ہمیں پاکستان میں اسلام کی حکومت قائم کرنی ہے اور یہ کام بہت بڑی جدوجہد کا مطالبہ کرتا ہے۔ ۱۵۔ اگست سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد ہمارے ملک کی صورت حال بالکل بدل گئی ہے۔ اب اس ملک کے لوگ اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے میں پوری طرح مختار ہیں۔ یہاں کے باشندوں کو اب یہ طے کرنا ہے کہ وہ اپنے لئے کس طریق زندگی کو، کن اصول اخلاق کو، اور کس نظام حکومت کو پسند کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ عنقریب دیکھیں گے کہ اس ملک میں ایک شدید کشمکش برپا ہونے والی ہے۔ ایک طرف نام نہاد مدعیان اسلام ہیں جن کو صرف اسلام کا نام باپ دادا سے ورثہ میں ملا ہے، لیکن اس کو طریق زندگی کی حیثیت سے انہوں نے نہ قبول کیا ہے نہ قبول کرنے پر تیار ہیں۔ اسلام کے نام پر جو حقوق حاصل ہو سکتے ہیں انہیں تو وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن جن پابندیوں کا اسلام مطالبہ کرتا ہے ان سے وہ خود بھی آزاد رہنا چاہتے ہیں اور ملک کو بھی آزاد رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ مسلمانوں کے اوپر کافرانہ حکومت قائم کرنے اور کافرانہ قوانین جاری کرنے کے ارادہ رکھتے ہیں۔ دوسری طرف ان کے مقابلہ میں وہ سب لوگ ہیں جو اسلام کو اپنے طریق زندگی کی حیثیت سے پسند کرتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ اس ملک میں اسلام کی حکومت قائم ہو۔ اور اسلام کا قانون جاری ہو۔

ان دونوں طاقتوں کے درمیان عنقریب ایک کشمکش رونما ہونے والی ہے۔

(ترجمان القرآن جولائی ۱۹۴۸ء صفحہ ۲۴)

اور سنئے آپ دیکھ چکے ہیں کہ جمہوریت کے متعلق مودودی صاحب کی رائے کیا تھی۔ یہاں پہنچتے ہی انہوں نے فرمایا۔

"وہ چونکہ جمہوریت کا ہے اس لئے حکومت کے مسلک کا انحصار عوام کی رائے پر ہوگا۔

(ترجمان القرآن جولائی ۱۹۴۸ء صفحہ ۲۵)

جب مودودی صاحب سے یہ کہا گیا کہ آپ ہندوستان میں کل تک یہ فرماتے تھے کہ صحیح اسلامی نظام قائم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کے قلب و دماغ میں اسلامی انقلاب پیدا کیا جائے لیکن اب آپ یہ فرماتے ہیں کہ جس قسم کے بھی یہ لوگ ہیں، انہی کی کثرت رائے سے حکومت قائم کر لی جائے تو آپ اصلاح خلق کا جو پروگرام لے کر اٹھے تھے وہ پروگرام کس طرح پورا ہوگا؟ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا۔

برائے اقتدار اصلاح خلق کی کوئی اسکیم بھی حکومت کے اختیارات پر قبضہ کئے بغیر نہیں چل سکتی۔ جو کوئی حقیقت میں خدا کی زمین سے فتنہ فساد کو مٹانا چاہتا ہو اور واقعی یہ چاہتا ہو کہ خلق خدا کی اصلاح ہو تو اس کے لئے محض واعظ اور ناصح ہو کر کام کرنا فضول ہے۔ اس کیلئے اٹھنا چاہیئے۔ اور غلط اصول کی حکومت کا خاتمہ کر کے، غلط کار لوگوں کے ہاتھ سے اقتدار چھین کر صحیح اصول اور صحیح طریقے کی حکومت قائم کرنی چاہیئے۔ (خطبات صفحہ ۲۳۱)

انہوں نے کہا کہ ہم پر جہاد فرض ہے اور جہاد کے معنی یہ ہیں کہ حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی جائے۔ چنانچہ

اقتدار چھین لو اسلام کی نگاہ میں یہ بات ہرگز کافی نہیں ہے کہ تم نے خدا کو خدا، اور اس کے قانون کو قانون برحق مان لیا۔ نہیں اس کو ماننے کے ساتھ ہی آپ سے آپ یہ فرض تم پر عائد ہو جاتا ہے کہ جہاں بھی تم ہو، جس سرزمین میں تمہاری سکونت ہو وہاں خلق خدا کی اصلاح کے لئے اٹھو، حکومت کے غلط اصول کو صحیح اصول سے بدلنے کی کوشش کرو۔ ناخدا ترس اور شتر بے مہار قسم کے لوگوں سے قانون سازی اور فرماں روائی کا اقتدار چھین لو اور بندگان خدا کی سربراہ کاری اپنے ہاتھ میں لے کر خدا کے قانون کے مطابق آخرت کی ذمہ داری و جواب دہی کا اور خدا کے عالم الغیب ہونے کا یقین رکھتے ہوئے حکومت کے معاملات انجام دو۔ اسی کوشش اور اسی جدوجہد کا نام جہاد ہے۔

(ایضاً صفحہ ۲۳۳)

ہمارے خدا نے ہمیں بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ

"تم روئے زمین پر خدا کے سب سے زیادہ صالح بندے ہوئے۔ لہٰذا آگے بڑھو۔ لڑ کر خدا کے

باغیوں کو حکومت سے بیدخل کردو اور حکمرانی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لو۔

(ایضاً صفحہ ۲۳۵)

مودودی صاحب ابھی کل تک یہ کہتے چلے آ رہے تھے کہ

اپنے منہ میاں مٹھو | اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مختلف جماعتیں اسلام کے نام سے کام کر رہی ہیں اگر فی الواقع اسلام کے معیار پر ان کے نظریات، مقاصد اور کارناموں کو پرکھا جائے تو سب کی سب جعلی کا سد نکلیں گی۔ (ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ سنہ ۱۳۵۹ھ صفحہ ۹۴)

اور اب ان کی جماعت کی طرف سے یہ کہا جا رہا تھا۔

آپ ہمارا ساتھ دیجئے | "میں مسلمانوں کے تمام گروہوں سے کہتا ہوں کہ یہاں شخصیتوں اور گروہوں کا سوال نہیں۔ بلکہ ہم سب خدا کے سامنے جوابدہ ہیں۔ اگر ہمارے ہاتھوں سے یا ہماری نگاہوں کے سامنے یہاں غیر اسلامی نظام قائم ہو گیا تو ہم سب اس کی عدالت میں پکڑے جائیں گے۔ اس لئے آپ اپنے سارے اختلافات کو بھول جائیے۔ آپ اگر الگ الگ رہے بیٹھے رہے تو یہ کام نہیں ہو سکے گا۔ اس مطالبہ کو منوانے کیلئے تمام ضروری تدابیر اختیار کیجئے اور آپ کو خوب معلوم ہے کہ کسی مطالبہ کو منوانے کیلئے کیا کیا تدابیر اختیار کیجاتی ہیں۔ ابھی ابھی آپ نے پاکستان کا مطالبہ منوا کر جو تجربہ کیا ہے اس سے فائدہ اٹھائیے اور جن صحیح اور موثر تدابیر کو آپ نے اس مطالبہ کو منوانے میں استعمال کیا ہے ان سب کو نظام اسلامی کے مطالبہ کے لئے بھی اختیار کیجئے۔ یہ مطالبہ بھی مخلصانہ کوشش چاہتا ہے، یہ بھی منظم اور متحد طاقت چاہتا ہے اور یہ بھی مال اور وقت اور آرام کی قربانیاں چاہتا ہے۔ اگر ان شرائط کو پورا کر کے آپ یہ ثابت کر دیں کہ یہ قوم کا اجتماعی مطالبہ ہے تو کس طرح ممکن ہے کہ آپ کے لیڈر اس کے خلاف جائیں۔ آپ اس کے لئے جلسے کیجئے اس کے لئے ریزولیوشن پاس کیجئے۔ اس کیلئے پوسٹر آویزاں کیجئے۔ اس کو ریل کے ڈبوں اور موٹر لبوں میں لکھوایئے اسے اپنی خط و کتابت کے کارڈوں اور لفافوں پر طبع کرایئے تاکہ اس مطالبے کے چار نکات آپ کے بچے بچے کی زبان پر ہوں۔ (ترجمان القرآن۔ جون سنہ ۱۹۴۹ء صفحہ ۲۳)

آپ نے دیکھا کہ پاکستان میں اپنی حکومت قائم کرنے کے لئے عوام کو کس طرح اپنے پیچھے لگانے کی مہم شروع کر دی گئی۔

جمہوری طریقے سے برسر اقتدار آنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ

(۱) اپنی جداگانہ پارٹی بنائی جائے۔

(۲) اور جب یہ دیکھا جائے کہ اس پارٹی کا اثر کافی حد تک بڑھ چکا ہے تو پھر انتخاب لڑا جائے۔

(۳) اس انتخاب کی رُو سے پارلیمان میں اپنی اکثریت پیدا کی جائے۔

(۴) اس طرح یہ اکثریت اپنی حکومت قائم کر لے۔

اب آپ یہ دیکھئے کہ ان شقوں کے متعلق مودودی صاحب کا پہلے فیصلہ کیا تھا اور اب انہوں نے کس طرح چولا بدلا تھا۔ جب قائداعظمؒ نے ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کی تنظیم نو سے آسے ایک مستحکم جماعت کی شکل دی تو مودودی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ اسلام میں الگ جماعتیں بنانا قطعاً جائز نہیں۔ چنانچہ انہوں نے فروری ۱۹۳۸ء کے رسالہ "پیغام حق" میں ایک طویل مقالہ لکھا جس میں انہوں نے کہا کہ ــــ

الگ جماعت کی تشکیل غلط ہے یہ قوم تو پہلے ہی ایک جمعیت ہے۔ اس جمعیت کے اندر کوئی الگ جمعیت الگ نام سے بنانا اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی وردی یا کسی ظاہری علامت یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق و امتیاز پیدا کرنا اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر کے ان کے اندر جماعتیں اور فرقوں کی عصبیتیں پیدا کرنا دراصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں ہے بلکہ ان کو اور کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں تفرقہ پردازی اور گروہ بندی ہے۔ لوگوں نے آنکھیں بند کر کے جمعیت سازی کے یہ طریقے اہل مغرب سے لئے ہیں۔ مگر ان کو معلوم نہیں کہ جو چیزیں دوسروں کے مزاج کو موافق آتی ہیں وہ مسلمانوں کے مزاج کو موافق نہیں آتیں۔ (پیغام حق۔ فروری ۱۹۳۸ء صفحہ ۹۳)

اُس وقت وہ اسلام تھا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی پارٹی بنائی اور نہ صرف یہ کہ اس خلاف اسلام اقدام کے خلاف مودودی صاحب کو کسی قسم کی خفت محسوس ہوئی انہوں نے اس پارٹی کا نام ہی جماعت اسلامی رکھا۔ پاکستان آنے کے بعد ابتدا میں انہیں اس کا خیال نہ تھا کہ انہیں پارلیمان میں الگ پارٹی بنانے کی ضرورت ہوگی۔ اس لئے انہوں نے اپنی دستوری تجاویز میں یہ لکھا کہ

اسمبلی میں پارٹی کا قیام ممنوع مجلس قانون ساز میں پارٹیاں بنانا از روئے دستور ممنوع ہونا چاہیئے۔
(دستوری تجاویز صفحہ ۱۴)

لیکن اب ان کے اسلام نے ان کے کان میں کچھ اور پھونکا ہے جس کی رُو سے

پارلیمانی پارٹی جائز جماعت اسلامی نے قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں اپنی پارلیمانی پارٹی بنانے کا فیصلہ کیا ہے معلوم ہوا ہے کہ جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے افراد کو ہر اسمبلی میں پارلیمانی پارٹی قائم کرنے کی ہدایت کی جائے۔ (کوہستان ۱۰۔ اگست ۱۹۶۳ء)

اتنا ہی نہیں بلکہ انہوں نے اگست سنہ ۱۹۶۲ء میں راولپنڈی کی پریس کلب میں یہ بھی کہا کہ

تعاون کی پیشکش جماعت کسی بھی ایسی پارٹی کے ساتھ تعاون کے لئے تیار ہے جو ملک کی خدمت کرنا چاہتی ہے جماعت کو دوسری سیاسی جماعتوں سے کوئی کد نہیں ہے۔ آپ نے مزید کہا کہ پہلے ان جماعتوں کا وجود میں آنا ضروری ہے۔ (نوائے وقت ۲۸۔ اگست سنہ ۱۹۶۲ء)

اب دیکھئے انتخابات کے متعلق!

یہ آپ اوپر دیکھ چکے ہیں کہ مودودی صاحب نے پہلے یہ بھی کہا تھا کہ اس قسم کے مسلمانوں کی آراء سے کبھی صحیح اسلامی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ پاکستان بننے کے بعد پہلے انتخابات سنہ ۱۹۵۰ء میں منعقد ہوئے۔ اس وقت مودودی صاحب کو معلوم تھا کہ ان کی جماعت کو انتخابات میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا انہوں نے یہ اعلان فرمایا کہ انتخابات میں شرکت ہی سرے سے خلاف اسلام ہے۔ چنانچہ انہوں نے اعلان فرمایا کہ

ناپاک طریق انتخاب اب ہم کو اس امر میں کوئی شک نہیں رہا ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی اور قومی سیاست کو جن چیزوں نے سب سے بڑھ کر گندا کیا ہے ان میں سے ایک امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا طریقہ ہے۔ اسی بنا پر جماعت اسلامی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس ناپاک طریق انتخاب کی جڑ کاٹ دی جائے۔ جماعت اسلامی نہ اپنے پارٹی ٹکٹ پر آدمی کھڑے کریگی نہ اپنے ارکان کو آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونے کی اجازت دیگی نہ کسی ایسے شخص کی تائید کرے گی جو خود امیدوار ہو۔ اور اپنے لئے ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ خواہ انفرادی طور پر یا کسی پارٹی ٹکٹ پر۔ یہی نہیں بلکہ جماعت اپنی انتخابی جد وجہد میں خاص طور پر یہ بات عوام الناس کے ذہن نشین کرے گی کہ امیدوار بن کر اٹھنا اور اپنے حق میں ووٹ مانگنا آدمی کے غیر صالح اور نااہل ہونے کی پہلی اور کھلی ہوئی علامت ہے۔ ایسا آدمی جب کبھی اور جہاں کہیں سامنے آئے لوگوں کو فوراً سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ ایک خطرناک شخص ہے۔ اس کو ووٹ دینا اپنے حق میں کانٹے بونا ہے۔

(بحوالہ جماعت اسلامی کی انتخابی جد وجہد "المنبر" لائل پور، ستمبر ۱۹۶۳ء)

اس کے بعد جب انہیں اس کا کچھ یقین ہو گیا کہ سنہ ۱۹۵۵ء کے دستور کے تابع ہونے والے انتخابات میں ان کی کامیابی کے امکانات ہیں تو انہوں نے اعلان فرمایا کہ

ناجائز جائز قرار پا گیا جماعت اسلامی نے سنہ ۱۹۵۵ء کے انتخابات کے موقع پر ایک پالیسی کا اعلان کیا تھا اور وہ یہ تھی کہ امیدواری چونکہ اسلام میں ناجائز ہے اس لئے ہم نہ خود امیدوار بن کر کھڑے ہوں گے اور نہ کسی

امیدوار کو ووٹ دیں گے۔ بعد میں تجربات سے ہم کو معلوم ہوا کہ ہم ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ ہر ضمنی اور عام انتخابات میں پورے ملک کی ہر نشست کے لئے اپنے معیار کے مطابق موزوں امیدوار کھڑے کر سکیں۔ اس بنا پر ہم نے سابقہ پالیسی میں یہ تغیر کیا کہ ہم خود تو امیدوار بن کر کھڑے ہونے سے بدستور مجتنب رہیں گے لیکن فاسد عناصر کے شر کو رفع کرنے اور ان کے مقابلے میں نسبتہً صالح اور اسلامی نظام کے حامی عناصر کو آگے بڑھانے کے لئے جن امیدواروں کی تائید ناگزیر محسوس ہوگی انہیں ووٹ دیں گے بھی اور دلوائیں گے بھی۔

(ترجمان القرآن بابت مئی سنہ ۱۹۵۸ء صفحہ ۱۲۳)

آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب کا یہ اعلان اس سے پہلے فیصلے سے یکسر متضاد ہے۔ لیکن یہ صاحب تو "مزاج شناس رسول" ہیں۔ اس لئے ان کی کوئی بات بھی دین کے خلاف نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اس نئے اعلان کے ساتھ ہی انہوں نے فرمایا۔

ہر معقول آدمی بیک نظر محسوس کرے گا کہ ہماری یہ نئی پالیسی ٹھیک ٹھیک دینی نظام کے مطابق ہے۔ اور اس میں دراصل کوئی اصول شکنی نہیں کی گئی۔ (ترجمان القرآن۔ مئی سنہ ۱۹۵۸ء)

جی! بالکل نہیں۔ آپ کی ہر بات دینی نظام کے ٹھیک ٹھیک مطابق ہوتی ہے۔ اور آپ کبھی اصول شکنی نہیں کرتے۔

اس کے بعد سوال سامنے آیا کہ کیا آنے والے انتخابات میں جماعت اسلامی کسی اور پارٹی کے امیدواروں کی بھی حمایت کریگی۔ کیونکہ ان کا فیصلہ یہ تھا کہ امیدوار کا صالح ہونا ضروری ہے۔ اور صالحین صرف ان کی جماعت کے اندر ہیں۔ لیکن گزشتہ اگست میں جب اُن سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ جماعت اسلامی ان امیدواروں کی حمایت کرے گی

جن کا کردار اور چلن ماضی میں بے داغ رہا ہو۔ اور جو اسلامی نظریہ کے لئے کام کرے۔

(بحوالہ امروز ۲۰۔ اگست سنہ ۱۹۶۳ء)

لیکن جب ان سے پوچھا گیا کہ اگر کنونشن مسلم لیگ کا کوئی امیدوار جماعت اسلامی کے معیار پر پورا اترتا ہو تو کیا یہ جماعت اس کی حمایت کرے گی۔ تو انہوں نے کہا کہ

کنونشن لیگ کا فرشتہ بھی غلط "اگر کنونشن مسلم لیگ کسی فرشتے کو بھی اُمیدوار کھڑا کرے تو جماعت اس کی حمایت نہیں کریگی کیونکہ ہمیں اس کے اصولوں سے اتفاق نہیں" (ایضاً)

اور اس کے بالمقابل یہ بھی فرمایا کہ

لیکن ہندو کی حمایت جائز "اگر ایک ہندو جمہوری نظام کی حمایت کرتا ہے تو اسے میری تائید حاصل ہوگی اس لئے

کہ اس نے یہ اصول تو تسلیم کر لیا کہ ملک کا نظام اکثریت کے نظریے کے مطابق ہونا چاہیئے ۔"
(ایضاً)

آپ نے غور فرمایا کہ ایک ہی سانس میں دین کے کیسے عظیم نکات بیان کئے گئے ہیں۔ یعنی

(۱) جماعت اسلامی صرف صالح امیدواروں کی حمایت کرے گی۔

(۲) کنونشن مسلم لیگ کا امیدوار کوئی فرشتہ بھی ہو گا تو جماعت اسلامی اس کی مخالفت کرے گی کیونکہ وہ تو صالح ہو نہیں سکتا ـــــ اور

(۳) اگر ایک ہندو جمہوری نظام کی حمایت کرے گا تو جماعت اسلامی اس کی تائید کرے گی اس لئے کہ اس کے صالح ہونے میں شک و شبہ ہی نہیں ہو سکتا۔

(۴) اور اس ہندو کی حمایت اس جمہوری نظام کی تائید کے صلے میں ہو گی جسے مودودی صاحب تشکیل پاکستان سے پہلے نوعِ انسانی کے لئے بدترین لعنت قرار دیا کرتے تھے۔

نیز انہوں نے انتخاب کے سلسلے میں اپنی جماعت کا نصب العین یہ بھی بیان کیا تھا کہ

"وہ گراہ اور آزمائے ہوئے غلط کار لوگوں کے مقابلے میں ان لوگوں کو انتخاب کے لئے قوم کے سامنے لانا چاہتی ہے، جو دیندار بھی ہوں اور دیانت دار بھی۔ اور اس کے ساتھ حکومت چلانے کی اہلیت بھی رکھتے ہوں۔" (منشور جماعت اسلامی ص۱۳)

اب ظاہر ہے کہ اس ہندو سے بڑھ کر دیندار، دیانت دار اور حکومت چلانے کی اہلیت کا مالک اور کون ہو سکتا ہے جو اکثریت کے نظام کے مطالبہ میں مودودی صاحب کا ہمنوا ہو۔

مودودی صاحب اب یہ کہہ رہے ہیں کہ ملک میں جمہوریت کی بحالی اور بالغوں کے لئے حقِ رائے دہندگی کے لئے ملک گیر مہم چلائی جائے گی۔ اس سے عوام کے ذہن میں یہ تصور جاگزیں کرانا مقصود ہے کہ موجودہ دستور کے مطابق نہ تو ملک میں جمہوری نظام قائم ہو سکتا ہے اور نہ ہی بالغوں کو رائے دینے کا حق حاصل ہے۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں اور لوگوں کو فریب دینے کے لئے وضع کی گئی ہیں۔ موجودہ آئین کی رُو سے ہر بالغ کو رائے دینے کا حق حاصل ہے۔ اور مجالسِ قوانین ساز انتخابات کے ذریعے وجود میں آتی ہیں۔ اسی کو جمہوریت کہا جاتا ہے۔ جمہوری نظام میں اس کی بھی گنجائش ہوتی ہے کہ مجلس قانون ساز یا پریذیڈنٹ کا انتخاب براہ راست ہو اور یہ بھی کہ یہ انتخاب بالواسطہ ہو۔ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ان میں سے کسی ایک طریقے کو زیادہ بہتر خیال کرتے ہوں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر آپ کا پسندیدہ طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔

تو آپ دو ہائی مچا دیں کہ ملک میں جمہوریت نہیں رہی۔

نیز موجودہ جمہوری نظام کی رُو سے پارلیمانی طریق بھی اختیار کیا جا سکتا ہے اور صدارتی نظام بھی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ان میں سے ایک طریق کو بہتر تصور کرتے ہوں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر ملک میں دوسرا طریق رائج ہو تو آپ اُسے غیر جمہوری قرار دے دیں۔ آپ کو یہ پورا حق حاصل ہے کہ آپ اپنے پسند کے طریق کے حق میں پروپیگنڈہ کریں۔ اور اسے اختیار کرنے کے لئے جدوجہد بھی کریں۔ لیکن دیانت کا تقاضا یہ نہیں کہ آپ یہ کہتے پھریں کہ جس طریق کو میں پسند کرتا ہوں وہ تو جمہوری ہے اور اس کے خلاف دوسرا طریق ڈکٹیٹر شپ ہے۔ مودودی صاحب یہی کچھ کر رہے ہیں۔

واضح رہے کہ جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا ہے کہ اس وقت ہمارے پیش نظر یہ بحث نہیں کہ ان طریقوں میں سے کون سا طریق بہتر ہے۔ نہ ہی موجودہ دستور کی وکالت یا مدافعت ہمارا مقصود ہے۔ ہم تو اس وقت صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مودودی صاحب جن باتوں کو اس سے پہلے خلافِ اسلام قرار دیتے تھے وہ اب کس طرح عین مطابق اسلام قرار دی جا رہی ہیں۔ اور جنہیں اس سے پہلے دین کا تقاضا بتایا جاتا تھا اب وہ کس طرح دین کی ضد بتائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم مسئلہ پریذیڈنٹ کے اختیارات کا ہے۔ موجودہ آئین کی رُو سے پریذیڈنٹ کی پوزیشن یہ ہے کہ اگر وہ پارلیمان سے کسی مسئلہ پر اختلاف کرے تو وہ ویٹو کا حق استعمال نہیں کر سکتا۔ اُسے وہ مسئلہ انتخابی ادارہ کے پاس ریفرنڈم کی شکل میں بھیجنا ہوگا۔ اور ریفرنڈم کا فیصلہ حرفِ آخر سمجھا جائے گا۔ اگر کسی وقت صدر، مجلسِ قانون ساز کو برطرف کرے گا تو اسے خود بھی اپنے عہدہ سے دست کش ہونا پڑے گا۔ یہ ہے صدر کی وہ پوزیشن جسے مودودی صاحب ڈکٹیٹر شپ قرار دے کر اس کے خلاف ملک گیر مہم چلانا چاہتے ہیں۔ لیکن ذرا دیکھئے کہ خود مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق، اسلام کی رُو سے صدر مملکت کو کس قسم کے اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔ وہ اپنے پمفلٹ "اسلام کا نظریہ سیاسی" میں لکھتے ہیں کہ

> "جب امیر کا چناؤ کیا جائے گا تو اس کو سیاہ و سفید کے اختیارات ہوں گے۔ امیر کو مشورہ کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ عموماً مجلس کے فیصلے کثرتِ رائے سے ہوں گے۔ مگر اسلام تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک اکیلے شخص کی رائے پوری مجلس کے مقابلے میں برحق ہو۔ اور اگر ایسا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ اس کی تائید میں ایک جمِ غفیر نہیں ہے۔ لہٰذا امیر کو حق ہے

کہ اکثریت کے ساتھ اتفاق کرے یا اقلیت کے ساتھ۔ اور امیر کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ پوری مجلس سے اختلاف کرکے اپنی رائے پر فیصلہ کرے۔ (ص ۴۵، ۴۶)

اس سے بھی واضح تر الفاظ میں وہ ترجمان القرآن کی جون ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں لکھتے ہیں کہ

"امیر مملکت شوریٰ کی اکثریت کے مقابلے میں ویٹو کا استعمال کرسکے گا۔"

(ص ۲۳)

جماعت اسلامی نے پاکستان کے آئین کے سلسلے میں جو دستوری خاکہ مرتب کیا تھا اس کی دفعہ ۲۶ میں یہ کہا گیا تھا کہ

ویٹو عین اسلام "امیر کو مجلس شوریٰ کی اکثریت کے مقابلہ میں ویٹو کا حق حاصل ہوگا۔"

(دو دستوری خاکے۔ ص ۱۰)

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ مودودی صاحب کے نزدیک صدر مملکت کے لئے ویٹو کا حق عین اسلام کے مطابق ہے۔ لیکن یہ کچھ وقت پہلے کا اسلام تھا۔ ان کے موجودہ اسلام کی رُو سے ویٹو کا تصور تک بھی غیر اسلامی ہے۔ ان کے رسالہ ترجمان القرآن کی نومبر ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں ایک صاحب کا سوال اور مودودی صاحب کا جواب شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہے۔

صدر ریاست کو ویٹو کا حق

سوال اور جواب ملاحظہ فرمائیے۔

سوال :- کچھ عرصے سے اخبارات کے ذریعہ سے تجاویز پیش کی جارہی ہیں کہ صدر پاکستان کو خلیفۃ المسلمین یا امیر المومنین کے معزز خطاب سے آراستہ کیا جائے۔ اس تصور میں مزید جان ڈالنے کے لئے یہ بھی کہا جارہا ہے کہ صدر کو حق تنسیخ ملنا چاہیئے۔ کیونکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جلیل القدر صحابہؓ کے مقابلے میں ویٹو سے کام لیا اور منکرین زکوٰۃ و مدعیان نبوت کی سرکوبی کے لئے جہاد کا حکم دے کر صحابہؓ کی رائے کو رد کردیا۔ گویا اس دلیل سے شرعی حیثیت کے ساتھ ویٹو جیسے دھاندلی آمیز قانون کو مستحکم فرمایا جارہا ہے۔

ان حالات کی روشنی میں جناب والا کی خدمت میں چند سوالات پیش کئے جارہے ہیں۔ امید ہے کہ صراحت جواب سے مطمئن فرمائیں گے۔

(۱) کیا حضرت ابوبکرؓ نے آج کے معنوں میں ویٹو استعمال فرمایا تھا۔ اور

(۴) اگر استعمال فرمایا تھا تو ان کے پاس کوئی شرعی دلیل تھی یا نہیں؟

نئی تاویل جواب:۔ خلفائے راشدینؓ کی حکومت کے نظام اور آج کل کے صدارتی نظام میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ان دونوں کو ایک چیز صرف وہی لوگ قرار دے سکتے ہیں جو اسلام کی تاریخ سے بالکل ناواقف ہیں۔ میں نے اس فرق پر مفصل بحث اپنی کتاب اسلامی ریاست صفحہ ۲۰۸ — ۲۰۹ پر کی ہے۔ آپ ملاحظہ فرمالیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ جس چیز کو خلافت کے نظام میں ویٹو کے اختیارات سے تعبیر کیا جا رہا ہے وہ موجودہ زمانے کے دستوری اصطلاح سے بالکل مختلف چیز تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کے صرف دو فیصلے ہیں جن کو اس معاملہ میں بنائے استدلال بنایا جاتا ہے۔ ایک جیش اُسامہؓ کا معاملہ۔ دوسرے مرتدین کے خلاف جہاد کا مسئلہ۔ ان دونوں معاملات میں حضرت ابوبکرؓ نے محض اپنی ذاتی رائے پر فیصلہ نہیں کر دیا تھا۔ بلکہ اپنی رائے کے حق میں کتاب و سنت سے استدلال کیا تھا۔ جیش اُسامہ کے معاملہ میں ان کا استدلال یہ تھا کہ جس کام کا فیصلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عہد میں کر چکے تھے اسے حضورؐ کا خلیفہ ہونے کی حیثیت سے انجام دینا میرا فرض ہے۔ میں اسے بدل دینے کے اختیارات نہیں رکھتا۔ مرتدین کے معاملہ میں ان کا استدلال یہ تھا کہ جو شخص یا گروہ بھی نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرتا ہو اور یہ کہے کہ میں نماز تو پڑھوں گا مگر زکوٰۃ ادا نہیں کروں گا۔ وہ مرتد ہے اسے مسلمان سمجھنا ہی غلط ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کی دلیل قابل قبول نہیں ہے جو کہتے ہیں کہ لا الٰہ الا اللہ کے قائلین پر تم کیسے تلوار اٹھاؤ گے۔ یہی دلائل تھے جن کی بنا پر صحابہ کرامؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے فیصلے کے آگے سر جھکا دیا۔ یہ اگر ویٹو ہے تو کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کا ویٹو ہے نہ کہ سربراہ ریاست کا۔

حقیقت میں اسے ویٹو کہنا ہی سرے سے غلط ہے۔ کیونکہ حضرت ابوبکرؓ کے استدلال کو تسلیم کر لینے کے بعد اختلاف کرنے والے صحابہ کرامؓ اس کی صحت کے قائل ہو گئے تھے۔ اور اپنی سابقہ رائے سے انہوں نے رجوع کر لیا تھا۔

(ترجمان القرآن نومبر ۱۹۶۳ء صفحہ ۶۷)

آپ نے غور فرمایا کہ کل تک جس ویٹو کے حق کو عین مطابق اسلام بتایا جاتا تھا آج اسے کس طرح دھاندلی

آمیز قانون قرار دیا جا رہا ہے۔ یوں ان کا اسلام ہر مصلحت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ یہی ہے ان کا وہ میکیاولی اسلام جس کے پیشِ نظر صدرِ مملکت کو اپنی یکم دسمبر سنہ ۱۹۶۳ء کی ماہانہ نشری تقریر میں اس تلخ حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کرنا پڑا کہ

"اب ایک اور دوں سے زیادہ مکار شخص، مذہب کا لبادہ اوڑھ کر میدان میں آگیا ہے۔ یہ شخص سیاسی مقاصد کے لئے مذہب کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔

(بحوالہ "امروز" ۲ ردسمبر سنہ ۱۹۶۳ء)

مودودی صاحب کا جوابِ دعویٰ

ہم یہاں تک لکھ چکے تھے کہ ترجمان القرآن کا دسمبر سنہ ۱۹۶۳ء کا شمارہ موصول ہوا۔ اس کے اشارات ان الزامات کے جواب کے لئے وقف کئے گئے ہیں جو مودودی صاحب کے خلاف آج کل عائد کئے جا رہے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان جوابات کا بھی سرسری جائزہ لے لیا جائے۔ اور جس چالبازی سے لوگوں کو دھوکا دینے کی کوشش کی گئی ہے اس کی بھی نقاب کشائی کر دی جائے۔

ایک نیا فریب آپ کو یاد ہوگا کہ جب وزیرِ امورِ داخلہ کے بیانات سے ملک کی فضا متاثر ہوئی تو اس کے توڑ کے لئے اس جماعت کی طرف سے کیا حربہ استعمال کیا گیا تھا۔ جماعت اسلامی کے قیم نے یہ بیان دیا تھا کہ

ان بیانات کا مواد ربوہ میں تیار کیا گیا تھا۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس ایک لفظ سے جماعت اسلامی، لوگوں کے ذہن کا رخ اپنی طرف سے ہٹا کر کس سمت کو پھیرنے کی کوشش میں تھی۔ اسی حربے کا اعادہ ان اشارات میں بھی کیا گیا ہے۔ ان میں کہا یہ گیا ہے کہ مودودی صاحب کی جن تحریروں سے ان کے خلاف یہ الزامات عائد کئے جا رہے ہیں۔

"ان کا یہ مطلب لبنک صرف دو گروہوں سے اخذ کیا ہے۔ ایک قادیانی، دوسرے منکرینِ حدیث۔ اس پر "الفضل" اور "طلوعِ اسلام" کے صفحات شاہد ہیں۔ اور ہر شخص جانتا ہے کہ یہ دونوں گروہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی عداوت میں کس قدر اندھے ہو چکے ہیں۔" (صـ۱۵)

قرآن کریم نے خناس" ذہنیت کی دہاہ بازی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ (۱۱۴/۵)

یعنی وہ لوگوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کرتی ہے اور یہی اس کا شر ہے جس سے پناہ مانگنے کی تاکید قرآن کریم نے کی ہے۔ آپ ان الفاظ پر ایک دفعہ پھر غور کیجئے کہ "ہر شخص جانتا ہے کہ اس عداوت کی اصل وجہ کیا ہے؟" یعنی یہ خود نہیں بتاتے کہ اس عداوت کی اصل وجہ کیا ہے؟ بس اتنا لکھ کر لوگوں کے دلوں میں ہر قسم کے وسوسے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ "الفضل" کا تو ہمیں علم نہیں، طلوع اسلام نے اس جماعت کی مخالفت کا آغاز ۱۹۴۰ء میں کیا تھا جب یہ بتایا تھا کہ مودودی صاحب قیادت کی ہوس میں پاکستان کی مخالفت سے مسلمانوں کو کس تباہی کے جہنم کی طرف دھکیل کرلے جانا چاہتے ہیں۔ تشکیل پاکستان کے بعد طلوع اسلام نے قوم کو مسلسل آگاہ کیا کہ مودودی صاحب کے عزائم قوم کے لئے کس قدر خطرناک اور تباہ کن ہیں۔ اگر مودودی صاحب میں ہمت ہے تو وہ ذرا مردانہ وار سامنے آئیں اور بتائیں کہ طلوع اسلام جو شروع سے ان کی مخالفت کرتا چلا آرہا ہے تو اس کی اصل وجہ کیا ہے۔ ضمناً یہ چیز بھی کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ طلوع اسلام کو وہ شخص منکر حدیث کہہ رہا ہے جسے خود مختلف فرقوں کے علماء نہ صرف منکر حدیث بلکہ مرتد اور کافر قرار دے چکے ہیں۔

حکومت پر بزور قبضہ

اشارات میں کہا گیا ہے کہ جو الزامات مودودی صاحب کے خلاف لگائے جا رہے ہیں ان میں سرفہرست

طاقت کے ذریعہ اقتدار کی تبدیلی۔

کا الزام نظر آئے گا۔ اس کے بعد لکھا ہے ــــ

وہ شخص جس نے مولانا مودودی کی تحریروں کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے یا جو ان کے طرز فکر سے بالکل سرسری واقفیت بھی رکھتا ہے، وہ جانتا ہے کہ یہ چیز مولانا کے مزاج سے قطعاً کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ انہوں نے سیاسی تبدیلی کے لئے قوت و طاقت کے استعمال کی ہمیشہ مذمت کی ہے۔ (ص۱)

ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ کیا مودودی صاحب نے یہ کہا ہے یا نہیں کہ

"اب تم روئے زمین پر خدا کے سب سے زیادہ صالح بندے ہو لہٰذا آگے بڑھو اور لڑ کر خدا کے باغیوں کو حکومت سے بے دخل کر دو اور حکمرانی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لو۔

(خطبات۔ ص۲۳۵)

اور کیا یہ تلقین بھی جماعت اسلامی کے لٹریچر میں موجود ہے یا نہیں؟

جب صالحین کا گروہ منظم ہو۔ اہلِ ملک کی عظیم اکثریت ان کے ساتھ ہو۔ یا کم از کم اس بات کا ظن غالب ہو کر عملی جدوجہد شروع ہوتے ہی اکثریت ان کا ساتھ دے گی اور کسی بڑی تباہی اور خونریزی کے بغیر مفسدین کے اقتدار کو ہٹا کر صالحین کا اقتدار قائم کیا جا سکے گا۔ اس صورت میں بلاشبہ صالحین کی جماعت کو نہ صرف حق حاصل ہے بلکہ ان کے اوپر یہ شرعی فرض ہے کہ وہ اپنی طاقت منظم کر کے ملک کے اندر بزورِ شمشیر انقلاب پیدا کر دیں۔ اور حکومت پر قبضہ کر لیں۔ (اسلامی ریاست [illegible])

انوکھی دوراندیشی

اب آگے بڑھئے! ترجمان القرآن کے پیش نظر اشارات میں کہا گیا ہے کہ مودودی صاحب بہت بڑے مدبر، عاقبت اندیش، دوربین اور قوم کے مربی اور محسن ہیں۔ جب ہندوستان میں مسلم لیگ، پاکستان کے لئے لڑائی لڑ رہی تھی تو اس کے پیش نظر دو خطرات تھے۔ ایک یہ کہ اگر مسلم لیگ کو اس جنگ میں شکست ہوگئی اور پاکستان نہ بن سکا تو ہندوستان میں مسلمانوں کو سنبھالنے والا کون ہوگا۔ اور اگر اسے کامیابی ہوگئی تو وہ کون لوگ ہوں گے جو پاکستان میں اسلامی حکومت قائم کر سکیں گے۔ یہ دونوں چیزیں مسلم لیگ کے بس میں نہیں تھیں۔ چنانچہ اس نازک وقت میں اس دوراندیش مدبر نے "پانچ چھ سو مخلص کارکنوں کا ایک مختصر سا گروہ اس غرض کے لئے منظم کیا کہ اگر خدانخواستہ اس جنگ میں مسلم لیگ ناکام ہوگئی تو یہ گروہ مسلمانوں کو سنبھالنے کی خدمت انجام دے سکے۔ اور اس گروہ کو جنگ سے الگ رکھا تاکہ اس کے لئے کام کرنا ممکن ہو ۔۔۔۔ اور اس کے لیے ارشاد ہے۔

کیا اس نے یہ اپنی قوم کے ساتھ کوئی برائی کی تھی۔ یہ دور اندیشی مذمت کی مستحق ہے یا اعتراف کی؟

(صفحہ ۱۸)

باقی رہا پاکستان میں اسلامی حکومت کا قیام۔ تو اس کے لئے ارشاد ہے کہ

اب اگر اسی دوراندیش انسان نے یہ وقت آنے سے برسوں پہلے ایک تربیت یافتہ منظم جماعت اس غرض کے لئے تیار کرنی شروع کر دی کہ اسلام سے جب یہ قرار ہونے لگے تو وہ جماعت عملاً کار ہاتھوں کو ... سکنے کے قابل ہو تو کیا اس نے اپنی قوم اور اپنے دین کے ساتھ یہ کوئی بے وفائی کی تھی؟ (صفحہ ۱۸)

یہی تو ہم کہتے ہیں کہ اس محسن کُش، احسان ناشناس قوم پر خدا کا عذاب کیوں نہ طاری ہو جس نے اپنے ایسے عظیم محسن کی قدر ناشناسی کی اور نہ تو انہیں ہندوستان میں اپنا قائد اعظم بنایا اور نہ یہاں پاکستان کا پریذیڈنٹ۔

اب آتا ہے وہ الزام کہ مودودی صاحب نے قائد اعظم اور مسلم لیگ کی مخالفت کی اس کا جو جواب ترجمان القرآن میں دیا گیا ہے

مخالفت کی مضحکہ خیز وجہ جواز اس پر تو آسمان کے فرشتے بھی سر دھنتے ہوں گے جو کچھ کہا گیا ہے ہی کا ملخص یہ ہو کہ لیگ اور قائداعظمؒ کی مخالفت مودودی صاحب ہی نے نہیں کی خود علامہ اقبالؒ نے بھی کی۔ آپ حیران ہوں گے کہ وہ کیسے؟ یہ بھی سُن لیجئے۔ اس کے لئے انہوں نے ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کی کتاب "اقبالؒ کے آخری دو سال" کا ایک اقتباس پیش کیا ہے ملاحظہ فرمایئے۔

تحریک عدم تعاون کے زوال کے بعد جب آل انڈیا مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہوا اور اس دور کا پہلا اجلاس مئی ۱۹۲۴ء میں لاہور کے گلوب تھیٹر میں منعقد ہوا تو ڈاکٹر صاحب کے مکان واقع میکلوڈ روڈ اور گلوب تھیٹر کی دیواریں ساتھ ساتھ تھیں۔ لیکن اس قرب مکانی کے باوجود ڈاکٹر صاحب نے مسلم لیگ کے جلسے میں قدم رکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ دسمبر ۱۹۲۷ء میں جب مسلم لیگ کے دو حصے ہو گئے تو ڈاکٹر صاحب جناحؒ لیگ کے مخالف اور شفیع لیگ کے حامی تھے۔ یہاں تک کہ وہ شفیع لیگ کے سکرٹری بھی بن گئے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں جب مسلم لیگ کا زور توڑنے کے لئے آل انڈیا مسلم کانفرنس معرض وجود میں آئی تو ڈاکٹر صاحب اس کانفرنس کے بڑے سرگرم رکن تھے۔ پہلے وہ اس کی مجلس عاملہ کے ممبر اور پھر اس کے صدر بن گئے تھے۔

ڈاکٹر سیف الدین کچلو جو راقم الحروف کے دیرینہ کرم فرما اور دوست ہیں ۱۹۲۶-۲۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سکرٹری اور مسٹر جناح کے دستِ راست تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ ذکر کیا تھا کہ جب دسمبر ۱۹۲۸ء میں کلکتہ کی آل انڈیا کنونشن نے ان ترمیموں کو بے دردی سے رد کر دیا جو مسٹر جناح نے پیش کی تھیں تو مسلم لیگ کی حالت سخت نازک ہو گئی۔ مسلمانوں کا سوادِ اعظم مسلم کانفرنس کی قیادت میں آ چکا تھا۔ ادھر کانگریس نے یوں ہمارا دستِ تعاون جھٹک دیا۔ ان حالات میں میں ڈاکٹر اقبالؒ کی خدمت میں لاہور حاضر ہوا تاکہ مفاہمت کی کوئی صورت پیدا کی جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے مسٹر جناحؒ کے سخت نکتہ چینی کی اور فرمایا کہ مسلمانوں کی سیاست میں مسٹر جناح نے جو الجھن پیدا کر دی ہے جب تک وہ اس پر ندامت کا اظہار کر کے آئندہ اس سے کلیۃً مجتنب رہنے کا وعدہ نہ کریں مصالحت نہیں ہو سکتی۔

(ترجمان القرآن دسمبر ۶۳ء صفحہ ۲)

یہ رہی علامہ اقبالؒ کی طرف سے مسلم لیگ اور قائداعظم کی مخالفت۔ اب رہے قائداعظمؒ تو ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ عمر بھر کانگریسی رہے۔ ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوششیں کرتے رہے۔ یہ چیزیں پاکستان کی مخالفت نہیں تھی تو اور کیا تھی؟ مودودی صاحب کا جواب آپ نے ملاحظہ فرما لیا۔ اب ایسے لوگوں سے کیا بعید ہے کہ اگر ان سے کہا جائے کہ

تم نے حضور نبی اکرمؐ کی شانِ اقدس میں گستاخی کی ہے تو یہ جواب میں کہہ دیں کہ (معاذ اللہ) (حضرت) عمرؓ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے لئے تلوار لے کر آ گئے تھے میں نے اگر چار باتیں حضورؐ کے خلاف کہہ دیں تو یہ کون سا جرم ہے؟

اعتراض یہ تھا (اور ہے) کہ مودودی صاحب نے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی۔ اس مطالبہ کی علمبردار جماعت (مسلم لیگ) کی مخالفت کی۔ اور اس مطالبہ کو پیش کرنے والے (قائداعظمؒ) کی مخالفت کی اور پورا زور لگایا کہ یہ مطالبہ پورا نہ ہونے پائے ـــــ اور اس اعتراض کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ علامہ اقبالؒ نے بھی تو ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کی مخالفت کی تھی اور محمد علی جناحؒ بھی تو کبھی کانگریس کا بہت بڑا لیڈر تھا۔ میں نے مسلم لیگ اور قائداعظم کی مخالفت کی تو کون سا انوکھا کام کیا جس کی وجہ سے مجھے مورد الزام ٹھہرایا جا رہا ہے؟

یہ طبیبِ مشفق؟

اب ان کے جواب کا آخری حصہ ملاحظہ فرمایئے! لکھتے ہیں۔

مصلحین اور رہنمایانِ قوم کی حیثیت اطبار کی سی ہوتی ہے جس طرح ایک طبیب ایک مریض کے مزاج اور دیگر احوال کو سامنے رکھ کر مختلف اوقات میں اس کے لئے مختلف دوائیں تجویز کرتا ہے بالکل اسی طرح قوم کے خادم بھی اُس کے احوال کے مطابق اصلاح حال کی کوششوں میں تغیر و تبدل کرتے رہتے ہیں۔ اس تبدیلی کے متعلق آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کی نہ میں مریض کو مار ڈالنے کا جذبہ کام کر رہا تھا۔ اسی طرح ایک ہی مریض کے لئے بسا اوقات دو مختلف طبیب مختلف علاج تجویز کرتے ہیں اور مریض بیک وقت ایک ہی طبیب سے علاج کرا سکتا ہے؟ اب اگر ایک طبیب کے علاج سے مریض کو ایک حد تک افاقہ ہو جائے تو کوئی عقلمند یہ نہیں کہہ سکتا کہ دوسرا طبیب اس مریض کا دشمن تھا۔ اور آئندہ وہ کبھی اس مریض کے قریب نہ پھٹکنے پائے۔ اس طرح کی باتیں، باتوں احمق لوگ کیا کرتے ہیں یا پھر وہ پیشہ ور لوگ جو اپنی پریکٹس کی اجارہ داری چاہتے ہوں۔ اور جن کے پیشِ نظر یہ بات ہو کہ مریض چاہے جئے یا مرے مگر ان کے مطب سے باہر نہ جانے پائے۔

(ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۶۳ء صفحہ ۸۲)

اسی دلیل کو ذرا آگے بڑھایئے تقسیم سے پہلے مسلمانوں کے مرض کا علاج تین طبیب کر رہے تھے (۱) نیشنلسٹ مسلمان (۲) قائداعظم اور (۳) مودودی صاحب (اپنے موجودہ دعوے کے مطابق) پہلے دونوں کا بھی یہ دعویٰ تھا کہ وہ مخلص طبیب ہیں اور مریض کی صحت کے متمنی۔ لیکن مودودی صاحب کی کیفیت یہ تھی کہ وہ ان دونوں طبیبوں کو بیچ بازار کھڑے ہو کر گالیاں دیتے تھے اور مریض کو ہر ممکن طریق سے روکتے تھے کہ ان کے مطب میں نہ جانا۔ یہ تمہارے دشمن ہیں۔ سوال یہ ہے کہ (خود مودودی صاحب کی اپنی دلیل کے مطابق) انہیں اس کا کیا حق پہنچتا تھا؟

اور اگر (شفا ہو جانے یا ترجمان القرآن کے الفاظ میں — ایک حد تک افاقہ ہو جانے کے بعد) مریض یہ کہے کہ مجھے تو اسی طبیب پر اعتماد ہے جس کے ہاتھوں میرے مرض میں افاقہ ہوا تو اس کے سر پہ تلوار کیوں رکھ دی جائے کہ نہیں، تمہیں اسی طبیب کی طرف آنا ہوگا جسے خود اعتراف ہے کہ اس کا تجویز کردہ نسخہ صحیح نہیں تھا۔

اور آخر میں ہم اسی دلیل کے منطقی نتیجہ تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ اگر آج پاکستان میں کوئی تحریک یہ دعویٰ لے کر اٹھے کہ مسلمانوں کی جداگانہ مملکت ایک غلط اقدام تھا۔ ان دونوں ملکوں کو پھر سے ایک ہو جانا چاہیئے اور اس تحریک کا داعی یہ کہنے میں کھڑا ہو کر قرآن سر پہ رکھ کر یہ کہے کہ حاشا وکلّا میرا اس میں کوئی ذاتی مفاد نہیں۔ میں یہ سب کچھ مسلمانوں کی بہتری کے لئے کر رہا ہوں — حتیٰ کہ اگر یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اسے اس مقصد کے لئے کسی بیرونی ملک سے امداد مل رہی ہے تو وہ کہے کہ یہ ٹھیک ہے۔ جس چیز کو میں مسلمانوں کی بہتری خیال کرتا ہوں اس کے لئے اگر کہیں سے امداد بھی لے لی جائے تو اس میں کیا حرج ہے — تو (ترجمان القرآن کی دلیل کے مطابق) نہ مسلمانانِ پاکستان کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اس شخص کو ملک کا غدار قرار دے اور نہ حکومتِ پاکستان کو اس کا کوئی حق کہ وہ ان سرگرمیوں کی روک تھام کے لئے کوئی قدم اٹھائے۔

یہ ہیں مودودی صاحب، اور یہ ہے ان کی سیاست۔ اس سے آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ کیا یہ اسلامی سیاست ہے جس میں ہر فیصلہ ایک اٹل اصول کے تابع ہوتا ہے، یا میکیاولی سیاست جس میں مصلحتوں کے ماتحت فیصلے بدلتے رہتے ہیں۔ ہندوستان میں جب مسلمانوں کی اکثریت قائد اعظمؒ کے ساتھ تھی تو مودودی صاحب کے اسلام کی رو سے اکثریت کا فرانہ حکومت قائم کرنے کا ذریعہ تھی اور اب اسی اکثریت کی رو سے جو حکومت مودودی صاحب قائم کرنا چاہتے ہیں وہ عین اسلامی ہوگی۔ وہاں جب مسلم لیگ کی تنظیم کی جا رہی تھی تو مودودی صاحب کے نزدیک مسلمانوں کی الگ پارٹی بنانا خلافِ اسلام تھا۔ اور اب پارٹیوں کا وجود عین مطابق اسلام ہے۔ جب خود انتخابات میں حصہ نہیں لینا تھا تو امیدوار کھڑے کرنا خدا اور رسول کے فیصلوں کے خلاف تھا اور اب انتخابات لڑنا عین منشائے خدا اور رسول کے عین مطابق ہے۔ اس وقت پارلیمان میں پارٹیاں بنانا ممنوع قرار دیا جاتا تھا۔ اب عین تقاضائے شریعت ہے۔ اس وقت صدر کے لئے ویٹو کا استعمال مطابق اسلام تھا۔ اب صدارتی نظام بھی غیر اسلامی ہے — حتیٰ کہ ان کی شریعت میں جھوٹ بولنا بھی نہ صرف جائز بلکہ واجب ہو جاتا ہے اور رشوت دے کر طلوعِ اسلام کے پرچے چوری سے حاصل کرنا عین خدمتِ اسلام۔

ہم ان سے یہ نہیں کہتے کہ آپ اس قسم کا سیاسی کھیل نہ کھیلیں۔ ہم کہتے صرف یہ ہیں کہ یہ کھیل کھلے بندوں کھیلیں۔ اسلام کا نقاب اوڑھ کر نہ کھیلیں — اور یہی طلوعِ اسلام کی ان سے مخالفت کی وجہ ہے۔

معراجِ نبوی صلعم کے دو رُخ

(۱)

[سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی ریڈیو کی تقریر جو ترجمان القرآن بابت اگست سنہ ۵۱ء میں شائع ہوئی تھی۔]

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبری کے منصب پر سرفراز ہوئے بارہ سال گزر چکے تھے ۵۱ برس کی عمر تھی۔ حرم کعبہ میں سو رہے تھے۔ یکایک جبریلؑ فرشتے نے آکر آپ کو جگایا۔ نیم خفتہ و نیم بیدار حالت میں اٹھا کر آپؐ کو زمزم کے پاس لے گئے۔ سینہ چاک کیا اور زمزم کے پانی سے اس کو دھو دیا۔ پھر اسے علم اور بُردباری اور دانائی اور ایمان و یقین سے بھر دیا۔ اس کے بعد آپؐ کی سواری کے لئے ایک جانور پیش کیا جس کا رنگ سفید اور قد خچر سے کچھ چھوٹا تھا۔ برق کی رفتار سے چلتا تھا اور اسی مناسبت سے اس کا نام "براق" تھا۔ پہلے انبیاءؑ بھی اس نوعیت کے سفر میں اسی سواری پر جایا کرتے تھے جب آپؐ سوار ہونے لگے تو وہ چمکا جبریلؑ نے تھپکی دے کر کہا، دیکھ کیا کرتا ہے آج تک محمدؐ سے بڑی شخصیت کا کوئی انسان تجھ پر سوار نہیں ہوا ہے۔ پھر آپؐ اس پر سوار ہوئے اور جبریلؑ آپؐ کے ساتھ ساتھ چلے۔ پہلی منزل مدینہ کی تھی جہاں اُتر کر آپؐ نے نماز پڑھی۔ جبریلؑ نے کہا اس جگہ آپ ہجرت کر کے آئیں گے۔ دوسری منزل طورِ سینا کی تھی جہاں خدا حضرت موسیٰؑ سے ہم کلام ہوا۔ تیسری منزل بیت لحم کی تھی جہاں حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے۔ چوتھی منزل بیت المقدس تھا جہاں براق کا سفر ختم ہوا۔

اس سفر کے دوران میں ایک جگہ کسی پکارنے والے نے پکارا ادھر آؤ۔ آپ نے توجہ نہ دی۔ جبریلؑ نے بتایا یہ یہودیت کی طرف بلا رہا تھا۔ دوسری طرف سے آواز آئی اِدھر آؤ۔ آپؐ اس کی طرف بھی ملتفت نہ ہوئے۔ جبریلؑ نے کہا یہ عیسائیت کا داعی تھا۔ پھر ایک عورت نہایت ہی سنوری نظر آئی اور اس نے اپنی طرف بلایا۔ آپؐ نے اس سے بھی نظر پھیر لی۔ جبریلؑ نے کہا یہ دنیا تھی۔ پھر ایک بڈھی عورت سامنے آئی۔ جبریلؑ نے کہا دنیا کی عمر کا

اندازہ اس کی عمر سے کیجیے۔ پھر ایک شخص ملا جس نے آپ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا مگر آپ اسے بھی چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ جبریلؑ نے کہا یہ شیطان تھا جو آپ کو راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔

بیت المقدس پہنچ کر آپ براق سے اُتر گئے اور اسی مقام پر اسے باندھ دیا جہاں پہلے انبیاء اس کو باندھا کرتے تھے۔ ہیکلِ سلیمانی میں داخل ہونے تو ان سب پیغمبروں کو موجود پایا۔ جو ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک دُنیا میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے پہنچتے ہی نماز کے لئے صفیں بندھ گئیں۔ سب منتظر تھے کہ امامت کے لئے کون آگے بڑھتا ہے۔ جبریلؑ نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھا دیا اور آپ نے سب کو نماز پڑھائی۔ پھر آپ کے سامنے تین پیالے پیش کئے گئے ایک میں پانی۔ دوسرے میں دودھ۔ تیسرے میں شراب۔ آپ نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا جبریلؑ نے مبارکباد دی کہ آپ فطرت کی راہ پا گئے۔

اس کے بعد ایک سیڑھی آپ کے سامنے پیش کی گئی اور جبریلؑ اس کے ذریعہ سے آپ کو آسمان کی طرف لے چلے۔ عربی زبان میں سیڑھی کو معراج کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے یہ سارا واقعہ معراج کے نام سے مشہور ہوا۔

پہلے آسمان پر پہنچے تو دروازہ بند تھا۔ محافظ فرشتوں نے پوچھا کون آتا ہے۔ جبریلؑ نے اپنا نام بتایا۔ پوچھا تمہارے ساتھ کون ہے۔ جبریلؑ نے کہا محمدؐ! پوچھا کیا انہیں بلایا گیا ہے۔ کہا ہاں۔ تب دروازہ کھلا اور آپ کا پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ یہاں آپ کا تعارف فرشتوں اور انسانی ارواح کی ان بڑی بڑی شخصیتوں سے ہوا۔ جو اس مرحلہ پر مقیم تھیں۔ ان میں نمایاں شخصیت ایک ایسے بزرگ کی تھی جو انسانی بناوٹ کا مکمل نمونہ تھے۔ چہرے مہرے اور جسم کی ساخت میں کسی پہلو سے کوئی نقص نہ تھا۔ جبریلؑ نے بتایا کہ یہ آدمؑ ہیں۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ۔ ان بزرگ کے دائیں بائیں بہت لوگ تھے۔ وہ دائیں جانب دیکھتے تو خوش ہوتے اور بائیں جانب دیکھتے تو روتے۔ پوچھا یہ کیا ماجرا ہے؟ بتایا گیا کہ یہ نسلِ آدمؑ ہے۔ آدمؑ اپنی اولاد کے نیک لوگوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ اور بُرے لوگوں کو دیکھ کر روتے ہیں۔

پھر آپ کو تفصیلی مشاہدہ کا موقع دیا گیا۔ ایک جگہ آپ نے دیکھا کچھ لوگ کھیتی کاٹ رہے ہیں اور جتنی کاٹتے جاتے ہیں اتنی ہی وہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ یہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے ہیں۔

پھر دیکھا کچھ لوگ ہیں جن کے سر پتھروں سے کچلے جا رہے ہیں۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ لوگ ہیں جن کی سرگرانی انہیں نماز کے لئے اٹھنے نہ دیتی تھی۔

کچھ اور لوگ دیکھے جن کے کپڑوں میں آگے اور پیچھے پیوند لگے ہوئے تھے اور وہ جانوروں کی طرح گھاس چر رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ ہیں جو اپنے مال میں سے زکوٰۃ و خیرات کچھ نہ دیتے تھے۔

پھر ایک شخص کو دیکھا کہ لکڑیوں کا گٹھا جمع کر کے اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور جب وہ نہیں اٹھتا تو اس

میں کچھ اور لکڑیاں بڑھا لیتا تھا۔ پوچھا یہ کون احمق ہے؟ کہا گیا یہ وہ شخص ہے جس پر امانتوں اور ذمہ داریوں کا اتنا بوجھ ہے کہ اُٹھا نہ سکتا تھا مگر یہ ان کو کم کرنے کے بجائے اور زیادہ ذمہ داریوں کا بار اپنے اوپر لادے چلا جاتا تھا۔

پھر یہ دیکھا کہ کچھ لوگوں کی زبانیں اور ہونٹ قینچیوں سے کترے جا رہے ہیں۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ غیر ذمہ دار مقرر ہیں جو بے تکلف زبان چلاتے اور فتنہ برپا کیا کرتے تھے۔

ایک اور جگہ دیکھا کہ ایک پتھر میں ذرا سا شگاف ہوا اور اس سے ایک بڑا موٹا سا بیل نکل آیا۔ پھر وہ بیل اسی شگاف میں واپس جانے کی کوشش کرنے لگا مگر نہ جا سکا۔ پوچھا یہ کیا معاملہ ہے۔ کہا گیا یہ اس شخص کی مثال ہے جو غیر ذمہ داری کے ساتھ ایک فتنہ انگیز بات کر جاتا ہے۔ پھر نادم ہو کر اس کی تلافی کرنا چاہتا ہے مگر نہیں کر سکتا۔

ایک اور مقام پر کچھ لوگ تھے جو اپنا گوشت کاٹ کاٹ کر کھا رہے تھے پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ دوسروں پر زبانِ طعن دراز کرتے تھے۔

انہی کے قریب کچھ اور لوگ تھے جن کے ناخن تانبے کے تھے۔ اور وہ اپنے منہ اور سینے نوچ رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کے پیٹھ پیچھے ان کی برائیاں کرتے اور ان کی عزت پر حملے کیا کرتے تھے۔

کچھ اور لوگ دیکھے جن کے ہونٹ اونٹوں کے مشابہ تھے اور وہ آگ کھا رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں کہا گیا یہ یتیموں کا مال ہضم کرتے تھے۔

پھر دیکھا کہ کچھ لوگ ہیں جن کے پیٹ بے انتہا بڑے اور سانپوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ آنے جانے والے ان کو روندتے ہوئے گزرتے ہیں مگر وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے۔ پوچھا یہ کون ہیں۔ کہا گیا سود خوار ہیں۔

پھر کچھ اور لوگ نظر آئے جن کے ایک جانب نفیس چکنا گوشت رکھا تھا اور دوسری جانب سڑا ہوا گوشت، جس سے سخت بدبو آ رہی تھی۔ وہ اچھا گوشت چھوڑ کر سڑا ہوا گوشت کھا رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں کہا گیا یہ وہ مرد اور عورتیں ہیں جنہوں نے حلال بیویوں اور شوہروں کے ہوتے ہوئے حرام سے اپنی خواہشِ نفس پوری کی۔

پھر دیکھا کہ کچھ عورتیں اپنے چھاتیوں کے بل لٹک رہی ہیں۔ پوچھا یہ کون ہیں۔ کہا گیا یہ وہ عورتیں ہیں جنہوں نے اپنے شوہروں کے سر ایسے بچے منڈھ دئے جو ان کے نہ تھے۔

انہی مشاہدات کے سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ایک ایسے فرشتے سے ہوئی جو نہایت ترش روئی سے ملا۔ آپؐ نے جبریلؑ سے پوچھا اب تک جتنے فرشتے ملے تھے سب خندہ پیشانی اور بشاش چہروں

کے ساتھ بیٹھے۔ ان حضرت کی خشک مزاجی کا کیا سبب ہے؟ جبریلؑ نے کہا اس کے پاس ہنسی کا کیا کام، یہ تو دوزخ کا داروغہ ہے۔ یہ سنکر آپ نے دوزخ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے یکایک آپ کی نظر کے سامنے سے پردہ اٹھا دیا اور دوزخ اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ نمودار ہو گئی۔

اس مرحلہ سے گزر کر آپ دوسرے آسمان پر پہنچے۔ یہاں کے اکابر میں دو نوجوان سب سے ممتاز تھے۔ تعارف پر معلوم ہوا یہ یحییٰؑ اور عیسےٰؑ ہیں۔

تیسرے آسمان پر آپ کا تعارف ایک بزرگ سے کرایا گیا جن کا حسن عام انسانوں کے مقابلے میں ایسا تھا جیسے تاروں کے مقابلہ میں چودھویں کا چاند۔ معلوم ہوا یہ یوسف علیہ السلام ہیں۔

چوتھے آسمان پر حضرت ادریسؑ، پانچویں پر حضرت ہارونؑ، چھٹے پر حضرت موسیٰؑ آپ سے ملے۔ ساتویں آسمان پر پہنچے تو ایک عظیم الشان محل (بیت المعمور) دیکھا جہاں بے شمار فرشتے آتے اور جاتے تھے۔ اس کے بعد آپؐ کی ملاقات ایک ایسے بزرگ سے ہوئی جو خود آپ سے بہت مشابہ تھے۔ تعارف پر معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔

پھر مزید ارتقا شروع ہوا یہاں تک کہ آپ سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچ گئے جو پیش گاہ رب العزت اور عالم خلق کے درمیان حد فاصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ نیچے سے جانے والے یہاں رک جاتے ہیں اور اوپر سے احکام اور فرامین براہ راست یہاں آتے ہیں۔ اسی مقام کے قریب آپ کو جنت کا مشاہدہ کرایا گیا۔ اور آپ نے دیکھا کہ اللہ نے اپنے صالح بندوں کے لئے وہ کچھ مہیا کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی ذہن میں اس کا تصور تک گزر سکا۔

سدرۃ المنتہیٰ پر جبریلؑ ٹھہر گئے اور آپ تنہا آگے بڑھے۔ ایک بلند ہموار سطح پر پہنچے تو بارگاہ جلال سامنے تھی۔ ہمکلامی کا شرف بخشا گیا۔ جو باتیں ارشاد ہوئیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) ہر روز پچاس نمازیں فرض کی گئیں۔

(۲) سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں تعلیم فرمائی گئیں۔

(۳) شرک کے سوا دوسرے سب گناہوں کی بخشش کا امکان ظاہر کیا گیا۔

(۴) ارشاد ہوا کہ جو شخص نیکی کا ارادہ کرتا ہے اس کے حق میں نیکی لکھ لی جاتی ہے اور جب وہ اس پر عمل کرتا ہے تو دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں مگر جو برائی کا ارادہ کرتا ہے اس کے خلاف کچھ نہیں لکھا جاتا اور جب وہ اس پر عمل کرتا ہے تو ایک ہی برائی لکھی جاتی ہے۔

پیشی خداوندی سے واپسی پر نیچے اترتے تو حضرت موسیٰؑ سے ملاقات ہوئی انہوں نے روداد سن کر

کہا میں بنی اسرائیل کا تلخ تجربہ رکھتا ہوں۔ میرا اندازہ ہے کہ آپ کی اُمت پچاس نمازوں کی پابندی نہیں کر سکتی۔ جا یئے اور کمی کے لئے عرض کیجئے۔ آپ گئے اور اللہ جل شانہٗ نے دس نمازیں کم کر دیں۔ پلٹے تو حضرت موسیٰؑ نے پھر وہی بات کہی۔ ان کے کہنے پر آپ بار بار اوپر جاتے رہے۔ اور ہر بار دس نمازیں کم کی جاتی رہیں۔ آخر پانچ نمازوں کی فرضیت کا حکم ہوا اور فرمایا گیا کہ یہی پچاس کے برابر ہیں۔

واپسی کے سفر میں آپ اسی سیڑھی سے اُتر کر بیت المقدس آئے، یہاں پھر تمام پیغمبر موجود تھے آپ نے ان کو نماز پڑھائی جو غالباً فجر کی نماز تھی۔ پھر براق پر سوار ہوئے اور مکہ واپس پہنچ گئے۔

صبح سب سے پہلے آپ نے اپنی چچازاد بہن امہانیؓ کو یہ روداد سنائی۔ پھر باہر نکلنے کا قصد کیا۔ انہوں نے آپ کی چادر پکڑ لی۔ اور کہا خدا کے لئے یہ قصہ لوگوں کو نہ سنایئے گا ورنہ ان کو آپ کا مذاق اڑانے کے لئے ایک اور شوشہ ہاتھ آجائے گا۔ مگر آپ یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئے کہ میں ضرور بیان کروں گا جرم کعبہ میں پہنچے تو ابوجہل سے آمنا سامنا ہوا۔ اس نے کہا کوئی تازہ خبر؟ فرمایا ہاں! پوچھا کیا؟ فرمایا یہ کہ میں آج کی رات بیت المقدس گیا تھا۔ کہا بیت المقدس؟ راتوں رات ہو آئے اور صبح یہاں موجود؟ فرمایا ہاں؟ کہا قوم کو جمع کروں۔ سب کے سامنے یہی بات کہو گے۔ فرمایا بے شک! ابوجہل نے آوازیں دے دے کر سب کو جمع کر لیا۔ اور کہا اب کہو۔ آپ نے سب کے سامنے پورا قصہ بیان کر دیا۔ لوگوں نے مذاق اڑانا شروع کیا۔ دو مہینے کا سفر ایک رات میں؟ ناممکن! محال! پہلے تو شک تھا اب یقین ہو گیا کہ تم دیوانے ہو گئے ہو۔

آناً فاناً یہ خبر تمام مکہ میں پہنچ گئی۔ بہت سے مسلمان اس کو سن کر اسلام سے پھر گئے۔ لوگ اس امید پر حضرت ابوبکرؓ کے پاس پہنچے کہ یہ محمدؐ کے دست راست ہیں۔ یہ پھر جائیں تو اس تحریک کی جان ہی نکل جائے۔ انہوں نے یہ قصہ سن کر کہا اگر واقعی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعہ بیان کیا ہے تو ضرور سچ ہوگا۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ میں تو روز سنتا ہوں کہ ان کے پاس آسمان سے پیغام آتے ہیں اور ان کی تصدیق کرتا ہوں۔

پھر حضرت ابوبکرؓ حرم کعبہ میں آئے، رسول اللہ موجود تھے اور ہنسی اڑانے والا مجمع بھی۔ پوچھا کیا واقعی آپ نے ایسا فرمایا ہے؟ جواب دیا۔ ہاں! کہا بیت المقدس میرا دیکھا ہوا ہے۔ آپ وہاں کا نقشہ بیان کریں۔ آپ نے فوراً نقشہ بیان کرنا شروع کر دیا۔ اور ایک ایک چیز اس طرح بیان کی گویا بیت المقدس سامنے موجود ہے۔ اور دیکھ دیکھ کر اس کی کیفیت بتا رہے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کی اس تدبیر سے جھٹلانے والوں کو ایک سخت ضرب لگی۔ وہاں بکثرت ایسے آدمی موجود تھے جو تجارت کے سلسلے میں بیت المقدس جاتے رہتے تھے وہ سب دل میں قائل ہو گئے کہ نقشہ بالکل صحیح ہے۔ اب لوگ آپ کے بیان کی صحت کا مزید ثبوت مانگنے لگے۔ فرمایا جاتے ہوئے میں فلاں مقام پر فلاں قافلہ پر سے گزرا۔ جس کے ساتھ یہ یہ سامان تھا۔ قافلے والوں کے اونٹ بھاگ

سے بھڑ گئے۔ ایک اونٹ فلاں وادی کی طرف بھاگ نکلا۔ میں نے قافلہ والوں کو اس کا پتہ بتایا۔ واپسی میں فلاں وادی میں فلاں قبیلہ کا قافلہ ملا۔ سب سوئے ہوئے تھے میں نے ان کے برتن سے پانی پیا۔ اور اس بات کی علامت چھوڑ دی کہ اس سے پانی پیا گیا ہے! ایسے ہی کچھ اور اتے پتے آپ نے دیئے اور بعد میں آنے والے قافلوں سے ان کی تصدیق ہوئی، اسطرح زبانیں بند ہوگئیں مگر دل یہی سوچتے رہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آج بھی بہت سے لوگ رہے ہیں کہ یہ کیسے ہوا؟

(۲)

[محترم پرویز صاحب کی تقریر جو انہوں نے ۱۱ر جون سنہ ۱۹۴۳ء کو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے براڈکاسٹ کی تھی۔ طلوعِ اسلام]

کائنات میں جب سے شعورِ انسانی نے آنکھ کھولی ہے، زندگی اور اس سے متعلقہ مسائل اس کیلئے ہمیشہ وجۂ کاوش و اضطراب رہے ہیں۔ انسان کیا ہے؟ وجۂ زندگی کا سرچشمہ کون سا ہے؟ اس کائنات میں انسان کا مقام کیا ہے؟ کاروانِ حیات کی منزل کونسی ہے؟ مرنے کے بعد انسان پر کیا گزرتی ہے؟ اور اسی قسم کے اور سوالات، ذہنِ انسانی میں پیدا ہوتے رہے اور علمِ انسانی ان کے اطمینان بخش حل کی تلاش میں ہمیشہ طلسم پیچ و تاب بنا رہا۔ فکرِ انسانی کی پوری تاریخ انہی سوالات کے حل کی تلاش کی مسلسل داستان ہے اور یونان کی حکمت گاہیں اور ایران کے آتشکدے، ہندوستان کی غاریں اور شام کی خانقاہیں سب اسی داستان کے بکھرے ہوئے اوراق ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ فکرِ انسانی نے اس باب میں بڑی کدوکاوش سے کام لیا ہے لیکن جہاں وہ ایک طرف ان مسائل کی گہرائیوں اور بلندیوں تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ ایک جویائے حقیقت کے لئے یہ امر بھی کم کچھ باعثِ حیرت نہیں کہ وہ دوسری طرف اس سطحیت پر آکر رک بھی گیا ہے کہ

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

اگر آپ غور کریں گے تو یہ حقیقت ابھر کر آپ کے سامنے آجائے گی کہ یہ مادی نظریۂ زندگی، یہ میکانکی تصورِ حیات، یہ دعویٰ کہ اندھی فطرت کے ایک ہنگامی عمل سے انسان میں زندگی نمودار ہوگئی اور اسکی موت کے ساتھ اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ فکرِ انسانی کی جستجو و کاوش کا ماحصل نہیں بلکہ ادراکِ حقیقت میں اس کے عجز و درماندگی کا اعتراف ہے یہ منزل پر پہنچے ہوئے مسافر کا سکون نہیں بلکہ تھک کر راستے میں بیٹھ جانے والے درماندہ راہرو کی صدائے دردناک ہے۔ یہ زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کا عزم نہیں بلکہ اس سے گریز و فرار کا پُرفریب گوشۂ عافیت ہے۔ اس نظریہ کی ابتداء یونان کی ابیقوریت سے ہوئی۔ لیکن یہ اپنے شباب پر یورپ کی عشرت گاہوں میں بیسویں صدی میں آکر پہنچا۔ لیکن یہ نظریہ اس قدر علم و حقیقت کے خلاف اور سطحیت کی کمزور بنیادوں پر استوار تھا کہ ابھی اپنی جوانی کی چند بہاریں بھی دیکھنے نہ پایا تھا کہ خود یورپ کے مفکرین کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہوگیا۔ اور سائنس کی تجربہ گاہوں سے جن میں اس نے نشوونما پائی تھی، ایڈنگٹن کے الفاظ میں یہ آوازیں اٹھنی

شروع ہوگئیں کہ

"ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ انسان خالص طبعی عناصر سے ایک مختلف اور جداگانہ شے ہے"۔

قطع نظر اس کے کہ یہ نظریہ کس طرح علم و حقیقت کے خلاف ثابت ہوا، یہ امر بھی غور طلب ہے کہ اس نے اس کائنات میں انسان کے مرتبہ بلند کو کس طرح ذلت کی پستیوں میں گرا دیا۔ اس سے انسان ایک مشین بن کر رہ گیا یا زیادہ سے زیادہ حیوان۔ زندگی نام رہ گیا ورتیابا جسم و جان کے لئے روٹی کا، اور انسانی جدوجہد کا ماحصل اس روٹی کا حصول۔ نہ انسان کیلئے کوئی بلند نصب العین رہا نہ زندگی کے لئے کوئی درخشندہ اقدار۔ زندگی بلا مقصد، مستقبل تاریک۔ اس کا لازمی نتیجہ وہ تصادم و تزاحم تھا جس نے یورپ اور اس کے ساتھ ساری دنیا کو اس طرح جہنم زار بنا رکھا ہے۔ ڈاکٹر مبین کے الفاظ میں :-

"ہمارے دور میں خوش حالی اس قدر فراواں ہے کہ بایدو شاید۔ عیش و عشرت کے سامان ہر جگہ موجود ہیں۔ مادی کامیابی کے مواقع نچلے سے نچلے درجے کے انسانوں تک کو میسر ہیں۔ لیکن انسان بے حد مضطرب و بے قرار ہے۔ تخلیق کی قوتِ محرکہ کبھی مستقل طور پر ایسے نظریہ کو سینے سے لگائے نہیں رکھ سکتی جو انسانی ذات کو محض مادے کی نمود قرار دے۔ ایسے نظریہ کے ماتحت افراد اور قومیں دونوں تباہ ہو کر خاک میں مل جاتی ہیں۔"

یہ تھا مادی نظریہ حیات۔

حکمتِ یونان کے ایک اور گوشے نے جس میں فیثا غورث کا نام ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ تسلسلِ حیات کا اعتراف تو کیا لیکن اس نے زندگی کو اس آب و گل کی دنیا میں چکر دینے شروع کر دئے جس سے اس کا تسلسل دوری حرکت میں تبدیل ہو کر بے نتیجہ بن کر رہ گیا۔ اور افقِ زندگی پر مایوسی کی ظلمت ناک گھٹائیں چھا گئیں۔

لیکن قرآن نے انسان کو ایک نیا تصورِ حیات دیا جس نے دنیائے فکر و عمل میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس نے کہا کہ زندگی ایک جوئے رواں ہے اور موت سے اس کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ اس سے ہوتا صرف اس قدر ہے کہ یہ ندی پہاڑ کی اوٹ میں جا کر تمہاری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ کاروانِ حیات ایک شاہراہِ عظیم یعنی صراطِ مستقیم پر ایک حسین و جمیل منزل کی طرف بڑھے جا رہا ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جس پر خالقِ کائنات کا قانونِ مشیت ساری کائنات کو رواں دواں اور کشاں کشاں لئے جا رہا ہے، اور خالقِ کائنات 'رب ذی المعارج' یعنی بلندیوں کا خدا ہے۔ اس لئے یہ صراطِ مستقیم نہ صرف سیدھی راہ ہے بلکہ بلندیوں کی طرف لے جانے والی بھی ہے۔ لہٰذا زندگی کی حرکت دوری نہیں بلکہ عمودی اور ارتقائی ہے۔ بلند سے بلند تر مقامات تک لے جانے والی۔ خاک کے ذرے اپنی ارتقائی منزل طے کر کے انسانی پیکر میں متشکل ہو گئے۔ اب اس کے بعد یہ ارتقاء طبیعی ارتقاء (PHYSICAL EVOLUTION) نہیں بلکہ شرفِ انسانیت کا ارتقاء ہوگا۔ اس عروج و ارتقاء سے انسان، قرآن کے الفاظ میں اقطار السمٰوٰت والارض۔ یعنی اس طبیعی کائنات (PHYSICAL UNIVERSE) کی حدود سے آگے نکل سکتا ہے۔ وہ قوت جس سے انسان شرفِ انسانیت کی ان محیّر العقول بلندیوں تک جا پہنچتا ہے۔

ضمیر کائنات یعنی قوانین خداوندی کی ہم آہنگی سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی کا نام اطاعت خداوندی ہے جو درحقیقت قوت حیات کے اس سرچشمۂ حقیقی سے رفاقت کا نام ہے۔ اسی اطاعت و رفاقت کو اسلام کہتے ہیں۔ اور اس کی مکمل تفسیر مقامِ محمدیؐ میں ملتی ہے۔ یہی مقامِ محمدیؐ شرفِ انسانیت کے نقطۂ کمال کا ترجمان ہے۔ اور اسی کا نام انسانیت کی معراجِ کبریٰ ہے۔ پیامِ محمدیؐ نے جو وحی کے ذریعہ صرف رسول ہی کو مل سکتا تھا انسان کو اس کے حقیقی مقام سے آشنا کرا دیا اور یہ بتا دیا کہ مادی دنیا ارتقائے انسانیت کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی تسخیر اور صحیح مقصد میں اس کا صرف اس ارتقاء کے لئے ممد و معاون ہوتا ہے۔ درخت کی جڑیں اس لئے خاک میں پیوست ہوتی ہیں کہ اس کی شاخیں آسمان کو چھو لیں۔ اس تسخیر مادہ سے خود مادہ کے اندر روح کی نمود ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح انسان اپنی ارتقائی منزل طے کرتا اقطار السمٰوٰت والارض۔ یعنی کائنات کی چاردیواری سے بلند ہوتا جاتا ہے۔ یہی معراجِ انسانیت ہے جس کے فقدان سے آج انسان باوجود ادعائے علم و تحقیق جہالت اور بہیمیت کی پستیوں میں گرتا جا رہا ہے۔ اور جس کی تصویر میتھن نے ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

> ہمارے دور میں جس چیز کی کمی ہے وہ انسانی خودی ہے جس کی نمود مادہ اور روح دونوں میں ہونی چاہیئے۔ انسان مادی کامرانیوں میں ڈوبا ہوا پریشان اور ایک عجیب الجھاؤ میں ہے۔ اس لئے کہ اس کی ذات اپنے آپ کو مادہ سے بلند نہیں لے جا سکتی بلکہ مادہ کے اندر ڈوبی ہوئی محسوس کرتی ہے۔ اس کا اضطراب یہ ہے کہ اس کا تحت الشعور یہ چاہتا ہے کہ وہ ثابت کرے کہ وہ مادہ سے جن چیزوں کی تخلیق کرتا ہے خود ان سے کچھ بیش ہے۔ وہ مادی کاریگری کو بحال رکھنا چاہتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی قوتِ تخلیق کی مدد کے لئے یہ ضروری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو مادیت سے بلند لے جائے اور اس کی ذات کا اندازہ اس کی مادی تخلیق سے نہ لگایا جائے بلکہ اس سے کہ وہ خود کیا ہے؟

سلام ہو اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ پر جس نے انسان کو بتایا کہ وہ مادی کاریگری کو بحال رکھتے ہوئے کس طرح اپنے آپ کو مادہ کی چاردیواری سے بلند لے جا سکتا ہے اور صرف بتایا ہی نہیں بلکہ خود معراجِ انسانیت کے اس افقِ اعلیٰ پر متمکن ہو کر دکھا دیا کہ ان بلند مقامات تک پہنچنے کی راہ کون سی ہے۔ اگر مسلمان دنیا میں معراجِ محمدیؐ کی یاد قائم رکھنا چاہتے ہیں تو اس کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنے آپ کو ایک ایسی ملت ثابت کرے جس کے سامنے زندگی کا بلند نصب العین ہو۔ اور دل میں اس نصب العین کے حصول کی تڑپ جس کی نگاہ پاک ہو اور حوصلے بے باک، سینہ کشادہ ہو اور ہمت بلند۔ جو کائنات کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں تعمیر انسانیت کے پاکیزہ مقصد میں صرف کرے اور اس طرح خود بھی خار و خس چمن بننے کی بجائے شاخِ نہالِ سدرہ بن جائے اور اپنے ساتھ ساری دنیا کو اس جہانِ آب و گل کی پستیوں سے نکال کر فلک الافلاک تک لے جائے اور یوں اس حقیقت کو واشگاف کر دے کہ

یہ نیلگوں فضا جسے کہتے ہیں آسماں — ہمت ہو پَرکشا تو حقیقت میں کچھ نہیں

بَابُ المراسلات

اشتراکی نظریۂ زندگی اور اسلام

ذیل کا خط بغور ملاحظہ فرمائیے۔

"بندہ ایک سال سے آپ کی تصنیفات کا مطالعہ کر رہا ہے اور طلوع اسلام بھی برابر زیر نظر ہے۔ آپ نے قرآن حکیم کی تفہیم جس نہج پر وچار کی ہے اپنی نوعیت میں بالکل منفرد ہے۔ تاریک خیال ملا کا آپ سے بیخ پا ہونا ایک قدرتی اور فطری امر ہے۔ آپ نے ثابت کیا ہے کہ قرآن حکیم نظام ربوبیت کا داعی ہے۔ اور حضرت علامہ اقبالؒ مرحوم کا کلام بھی آپ کے ہمنوا ہے۔ چونکہ نظام ربوبیت اپنے خواص میں انقلابی فطرت کا ہے اور ملاازم فطرتاً اس کی ضد ہے۔ بقول کسے۔

ہرگز مگو کہ شیخ شود اہلِ انقلاب   باور مکن کہ ہست در عالم غراب سُرخ

پرویز صاحب! نظام ربوبیت سے جو آپ کی غایت ہے وہ بالکل درست ہے لیکن ذرائع حصول میں مجھے اختلاف ہے لہذا اپنے سوال کا جواب بہ توسل طلوع اسلام چاہتا ہوں۔ اگر جواب مذہبی عقیدت مندی کے جذبات سے ذرا ہٹ کر مدلل اور تاریخی وجوب وحقائق کا حامل ہو تو میرے لئے زیادہ مؤثر و مسکت ہوگا۔

قدیم اشتراکی نظام سے لے کر آج تک تدریجی ادوار میں ارتقائی قوانین قدرت جاری وساری ہیں۔ مادی تاریخ ان ادوار کا تعین کرتی چلی آرہی ہے۔ مذہب کی دخیل کاری مادی تاریخ کے عوامل میں دست انداز نہیں ہوئی ہے۔ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے اپنے ابتدائی ایام میں تاریخ کے مادی تقاضوں سے ٹکر لی اور ایک مخصوص خطہ میں ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کی جو سراسر اپنی فطرت کے لحاظ سے اس وقت کے مادی دور سے جو اس زمانہ کا طبعی تاریخی دور تھا الگ تھلگ تھا۔ یہ پیغمبر اسلامؐ کی بے پناہ روحانیت کا کرشمہ تھا اور تاریخی معجزہ جو ایک معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن شارع اسلام کے رخصت ہوتے ہی چند ماہ و سال کے اندر یہ اسلامی نظام جو تاریخی لحاظ

سے قبل از وقت تھا ختم ہو گیا اور "مستثنیات" واقعات کی تعریف میں جگہ پا گیا۔ وہ لوگ جنہوں نے اپنے رسول پاک سے بہ نفس نفیس تربیت پائی تھی اور قیصر و کسریٰ کو اس واسطے ختم کیا تھا کہ یہ غیر صالح نظام کے نمائندہ ہیں۔ چند ہی مدت کے بعد اسی غیر صالح نظام کے شہنشاہ بن کر جلوہ نما ہوئے اور تاریخ کا تیز رو دھارا اسی سمت ہی بہنے لگا جس سمت سے اس کو غیر طبعی طور پر موڑنے کی کوشش کی گئی تھی۔ کیونکہ تاریخ کے ارتقائی مادی تقاضے ہی تاریخ سے عبارت ہیں۔

یہ امر بالکل غیر طبعی اور غیر فطری ہے کہ بچہ پیدا ہوتے ہی بڑھاپے کی عمر میں پہنچ جائے اور شیر خوارگی، بچپن عنفوانِ شباب، شباب اور کہولت کے ادوار سے گزرے ہی نہ — ایسا ہونا ناممکنات سے ہے کیونکہ انسان کو ان تمام ارتقائی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور بعینہ یہی ارتقائی قوانین انسانی معاشرہ میں بھی موجود ہیں — جہاں منزل بہ منزل ایک دور سے دوسرے دور میں داخل ہونا پڑتا ہے جیسے برف کو پانی اور پانی کو بھاپ میں تبدیل ہونے کے لئے انقلابی عملوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور ان تینوں یعنی برف، پانی، اور بھاپ میں اصل ہستی پانی کی ہے جس نے مختلف مدارج میں پہنچ کر اپنی اصل ہستی کو فنا نہیں کیا ہے بلکہ اپنے خواص اور صورت نوعیہ میں تبدیلی پیدا کر لی ہے۔ بعینہ اسی طرح یہ کاروانِ زندگی ابتدا میں پھسل پھسل کر اور رینگ رینگ کر چلتا ہے۔ آہستہ آہستہ تاریخی عوامل کے تھپیڑوں کو سہنے کی اپنے اندر قابلیت پیدا کرتا ہے۔ یعنی تنازع للبقا کی قوتیں بڑھتی جاتی ہیں۔ اور اس کے اندر روانی پیدا ہو جاتی ہے اور اسی طرح یہ کارروان اور تاریخی ارتقائی مراحل طے کرتا ہے اور اب یہ ایٹم اور برقیات کے دور میں ہے۔ پانی کی طرح زندگی کے ان مختلف قافلوں کی اصل بھی مادی تاریخ ہی ہے۔ جو مختلف ادوار میں اپنی صورت نوعیہ اور خواص تبدیل کرتی جا رہی ہے۔ اگر کسی سوسائٹی یا مذہب کے خیالات کا رجحان ترقی پسندانہ ہوتا ہے۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ اپنے ان اعمال و افعال کی تجدید بھی کرتا جاتا ہے جو نئے مادی تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتے ہیں تو ایسا نظام ترقی پسندانہ معاشرہ کہلاتا ہے۔ مادی تاریخ کے یہ سائنٹفک اصول ہیں جن کو نہ ماننا حقیقت کا منہ چڑانا ہے۔ اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کیا ہم جدلی تاریخ کے سائنٹفک مطالعہ کے بغیر مادی تقاضوں اور عوامل کا درست تجزیہ کر سکتے ہیں۔ اور صرف مذہبی پیشوا اس قابل ہیں کہ اپنے مذہبی علوم کے سہارے سے تاریخ کا پہیہ ہمیشہ آگے کو لے جائیں۔ ایسا ہرگز نہیں۔ ان کی تاریخ رجعت پسندانہ تاریخ ہے۔ آئین نو سے ڈرنا، رہِ کہن پہ اڑنا۔ منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں"۔ چونکہ پیغمبر کا ہر فعل خواہ وہ وقتی تقاضے کی مصلحت پر مبنی ہے وہ مذہب کی اصطلاح میں "سنت" کہلاتا ہے۔ جس کو ترک کرنا مذہب کی اصطلاح میں کفر تصور کیا جاتا ہے۔ خواہ پیغمبر کے اس فعل کی افادیت صرف وقتی طور پر ہو۔ اور بعد کے حالات میں اس فعل پر عمل کرنا سراسر ناقابلِ عمل ہو۔ جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ کو ان کی خلافت کے عہد میں یہ مشورہ دیا گیا کہ آپ خزانہ عامرہ کو ہر شام خالی نہ کر دیا کریں۔ بلکہ خزانہ کو باقاعدہ جمع کریں۔ اور کارکنانِ حکومت کی باقاعدہ ماہانہ تنخواہ مقرر فرمائیں تو آپ نے جواب دیا کہ

میں سنتِ رسولؐ کے خلاف نہیں کر سکتا ہوں۔ بہرحال یہ ایک امرِ واقعہ ہے کہ پیغمبرِ اسلام جن خطوط پر معاشرہ کی تشکیل چاہتے تھے وہ نہ ہوا اور معاشرہ مادی "تاریخ کے عوامل کی سنت" کا بیرو کار رہا۔ اور مذہبی پیشواؤں نے اس وقت کے صاحبِ اقتدار طبقہ کی خواہشات کے مطابق جواز نکالنے کا کام سنبھال لیا جو آج بھی جاری ہے۔

محترم پرویز صاحب! آپ اس بستی یعنی پاکستان میں واحد شخص ہیں جو فرماتے ہیں کہ "الارض اللہ اور نظامِ ربوبیت قائم ہونا چاہیئے دوسری طرف شرق تا غرب تمام مولوی صاحبان یک زبان آپ کے خلاف تکفیر کے فتوے دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو اسلام کا ماحصل صرف چار نکاحوں تک جانتے ہیں۔ لیکن جماعتِ اسلامی کے امیر اسلام کا نام لے کر جاگیرداری نظام کا جواز نکالتے ہیں۔ اور اپنی کتاب "سود حصہ دوم" میں فرماتے ہیں "ایک مربع گز سے لے کر اگر کسی شخص کے قبضہ میں اس قدر رقبہ ہو جس کی کوئی حد ہی مقرر نہ ہو اگر جائز طریقے سے قابض ہے تو شریعت کی رُو سے درست ہے"۔ لیکن آپ فرماتے ہیں کہ زمین اللہ کی ہے اس پر کسی کی ملکیت نہیں ہے۔

وہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں میری نہیں تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں

آپ بھی جواز اپنے دعوے کا قرآن ہی سے نکالتے ہیں اور مودودی صاحب بھی قرآن ہی سے۔ جن کے نزدیک یہ زمین پاکستان کھوڑوں۔ دولتانوں اور نوابوں کی ہے۔

خداوندا! یہ تیرے سادہ لوح بندے کدھر جائیں کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

کیا یہ ایک حقیقت نہیں ہے کہ حصولِ پاکستان سے پیشتر کیا وعدے کئے تھے کہ پاکستان بن جانے کے بعد آپ کے لفظوں میں نظامِ ربوبیت قائم کیا جائے گا۔ اور حضرت عمرؓ کا دور لوٹ آئے گا۔ عوام نے ہولناک اور بے مثال قربانیاں دیں۔ پاکستان بن گیا۔ سولہ سال گزر گئے اور ان سولہ سالوں میں ہر صدرِ مملکت اور ان گنت وزیروں نے اور مولوی صاحبان نے یہی کہا کہ ہمارا نظام اسلامی ہونا چاہیئے لیکن مادی تاریخ کہتی ہے کہ نہیں۔ نظام صرف میری سنت پر چلنا چاہیئے۔ آپ غور فرمائیں کہ ہماری حکومت اور علمائے دین دونوں فریق یہی سمجھتے ہیں کہ اسلامی نظام ہونا چاہیئے لیکن یہ دونوں فریق اسلامی نظام بنانے سے عاجز ہیں۔ اگر آپ نظامِ ربوبیت پیش کرتے ہیں تو علمائے دین کے نزدیک کافر ٹھہرتے ہیں۔ وہ حرمِ خانۂ کعبہ سے بھی اسلامی نظام کی آواز نہیں آتی ہے۔ بلکہ عربوں کا آج ایک ہی محبوب نعرہ ہے۔ (عرب نیشنلزم زندہ باد) لیکن آج زمین میر و سلطان سے بے زار ہو رہی ہے اور ہمارے ملک کا جاگیرداری نظام عالمِ نزع میں ہے۔ ہمیں آگے بڑھنے کے لئے "تاریخ کے مادی اصولوں ہی سے راہنمائی لینی چاہیئے۔ اور اپنے اردگرد کے حالات اور تجربوں سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ نظامِ ربوبیت تک پہنچنے کے لئے سیدھا راستہ یہی ہے۔"

طلوع اسلام

ہم نے اس تفصیلی خط کو بتمامہ اس لئے شائع کیا ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ اشتراکی فلسفۂ حیات کیا ہے؟ اور اس فلسفہ سے متاثرذہن کس نہج پر سوچتا ہے۔ ہم اس حقیقت کو متعدد بار واضح کر چکے ہیں کہ ایک چیز ہے اشتراکی نظام معاش اور دوسری چیز ہے اشتراکی فلسفۂ زندگی۔ لیکن چونکہ اشتراکی نظام معیشت کی عمارت، اشتراکی فلسفہ کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے اس لئے اس نظام کو سمجھنے کے لئے اس فلسفہ کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ بعینہٖ جس طرح اسلامی نہج زندگی کے کسی گوشے کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی فلسفۂ حیات یا نظریۂ زندگی کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ جو نظام یوں ہی ہنگامی طور پر اپنا لیا جائے اس کی صورت کچھ اور ہوتی ہے۔ لیکن جو نظام کسی خاص فلسفۂ حیات کی پیداوار ہو اُسے اس فلسفۂ حیات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے اس فلسفہ کا سمجھنا لاینفک ہوتا ہے۔

۲۔ مشہور جرمنی مفکر، ہیگل کا پیش کردہ نظریہ یہ تھا کہ ایک تصور (IDEA) پیدا ہوتا ہے۔ وہ بڑھتا پھولتا۔ پھلتا۔ پروان چڑھتا ہے۔ جب وہ اپنی تکمیل تک پہنچ جاتا ہے تو اس میں سے ایک اور تصور کی نمود ہوتی ہے جو پہلے تصور کی ضد ہوتا ہے۔ جو کچھ پہلے تصور کے ساتھ ہوا تھا وہی کچھ اس جدید تصور کے ساتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ گردش دولابی شروع سے آج تک جاری ہے اور اسی طرح جاری رہے گی۔ اس عمل کا نام جدلی عمل (DIALECTICAL PROCESS) ہے۔ جب ہیگل سے پوچھا گیا کہ وہ کون سی قوت ہے جو اس عمل کو، ایسے ضبط اور نظم کے ساتھ جاری رکھتی ہے؟ تو اس نے کہا کہ اس مخفی قوت کا نام "روحِ عالم" (WORLD — SPIRIT) ہے جو اس عمل سے خود اپنی ذات کی تکمیل چاہتی ہے۔

مارکس (MARX) ہیگل کے فلسفہ کا متبع تھا۔ لیکن اس نے ذرا آگے جا کر، ہیگل سے ایسا اختلاف کیا کہ اس کا یہ اختلافی نظریہ خود ایک الگ فلسفہ بن گیا۔ اس نے کہا کہ جنگِ اضداد کا جو تصور ہیگل نے پیش کیا ہے وہ تو درست ہے لیکن یہ جنگ تصورات (IDEAS) میں نہیں ہوتی بلکہ نظامہائے زندگی (SOCIAL ORDERS) میں ہوتی ہے۔ ایک نظام قائم ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے عروج تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے اندر سے بعض مخالف قوتیں وجود کوش ہوتی ہیں۔ یہ قوتیں اس نظام کو تباہ کر کے اسکی جگہ ایک جدید نظام کو مسلط کر دیتی ہیں۔ جو پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے۔ اور یہ جنگ اسی طرح آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس سے پہلے نظام سرمایہ داری دنیا پر مسلط تھا۔ اب اس کی جگہ، اشتراکی نظام لے رہا ہے جو اس پہلے نظام کی ضد ہے۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ یہ جنگِ اضداد کون سی قوت کی رُو سے جاری رہتی ہے تو اس نے کہا کہ اسے تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کہا جاتا ہے۔ یہ قوت اس قدر محکم اور مہیب ہے کہ

دُنیا کی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ انسان اس کے سامنے کیسر بے بس اور عاجز ہے۔ جب یہ ایک نظام کو مسلط کرتی ہے تو انسان اس نظام کو بدل ہی نہیں سکتا۔ اسے اس نظام کو مجبوراً تسلیم اور اختیار کرنا پڑتا ہے ــــ اختیار کرنا کیا معنیٰ اس کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔ اور جب وہ قوت اس نظام کو فنا کرنا چاہتی ہے تو انسانوں کی کوئی تدبیر اُسے بچا نہیں سکتی۔ مارکس کے نزدیک انسان کی ساری تاریخ اس کی اس بے بسی اور بیکسی کی داستان ہے۔ خدا۔ وحی۔ مستقل اقدار۔ حق و باطل کا تصور اس کے نزدیک سب افسانے ہیں۔ اور ذہن انسانی کی تخلیق۔ حقیقت صرف تاریخی وجوب کی ہے۔ مارکس کے اس نظریہ کی عملی تعبیر کا نام، "تاریخ کی مادی تعبیر" (MATERIALISTIC INTERPRETATION OF HISTORY) ہے۔ وہ اس تعبیر کو اس قدر حتمی اور یقینی قرار دیتا ہے کہ اس کے نزدیک، دُنیا کی کوئی طاقت اس کے دھارے کا رُخ بدل نہیں سکتی۔

۳۔ یہ ہے مختصر الفاظ میں اشتراکی فلسفۂ زندگی۔ اس کی روشنی میں، آپ مندرجہ بالا خط پڑھیں گے تو بات صاف ہو جائے گی کہ اس فلسفہ سے متاثر ذہن کس نہج پر سوچتا ہے۔

اسلام کا نظریہ حیات، اس فلسفہ کے بالکل برعکس اور اس کی ضد ہے۔ اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ حق (TRUTH) ایک ابدی حقیقت ہے، جو ذہنِ انسانی کی پیداوار نہیں۔ یہ اپنے مقام پر اٹل اور غیر متبدل ہے اور کسی شے سے اثر پذیر نہیں ہوتا۔ جو تصورات حق کے مطابق ہوں وہ مبنی بر صداقت ہوں گے۔ انہیں مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہا جاتا ہے۔ یہ اقدار، حق پر مبنی ہونے کی وجہ سے ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ یہ وحیٔ خداوندی کی رُو سے (بواسطہ حضرات انبیائے کرامؑ) انسانوں کو ملتی ہیں تاکہ وہ ان کے مطابق اپنا نظامِ زندگی قائم کریں۔ جو نظام ان اقدار کے مطابق قائم ہوتا ہے اسے حق کا نظام کہا جاتا ہے۔ اس نظام کی عملی شکل، زمانے کی ضرورتوں کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے۔ لیکن جن بنیادوں پر یہ استوار ہوتا ہے ان میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔

جو تصورات، مستقل اقدار کے خلاف ہوں انہیں باطل کے تصورات کہا جاتا ہے، جو حق کی نقیض ہے۔ ان دونوں تصورات کی باہمی کشمکش چلتی رہتی ہے اور اس کشمکش میں حق، باطل کو شکست دیتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح باطل آہستہ آہستہ کمزور ہوتا جاتا ہے۔ تاآنکہ آخر الامر یہ میدان چھوڑ جائے گا۔ اور حق کا غلبہ مکمل ہو جائیگا۔

حق اور باطل کی یہ کشمکش، خدا کے تخلیقی قانون کی رُو سے جاری ہے لیکن چونکہ اس قانون کی رفتار، ہمارے حساب و شمار کی پیمائش کے مطابق بہت سُست ہوتی ہے۔ (خدا کا ایک ایک دن، قرآن کے الفاظ میں ہزار ہزار

بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کے برابر ہوتا ہے) اس لئے اس کشمکش کے نتائج بڑے غیر محسوس اور غیر مرئی ہوتے ہیں۔ لیکن تاریخی نوشتوں پر نگاہ ڈالی جائے تو ان سے اس حقیقت کی شہادت مل سکتی ہے کہ یہ کشمکش جاری ہے اور اس میں حق (تعمیری تصورِ حیات) باطل (تخریبی نظریہ) پر بتدریج غالب آرہا ہے۔

اسلام کی رُو سے انسان بے بس اور بیکس۔ مجبور و مقہور مخلوق نہیں۔ یہ صاحبِ اختیار و ارادہ ہستی ہے۔ اسے اس انتخاب (CHOICE) کی قوت دی گئی ہے کہ وہ اپنا نظام حق کے مطابق قائم کرے یا باطل کے مطابق۔ جب انسانوں کی کوئی جماعت حق کے مطابق نظام قائم کرتی ہے تو اس کے تعمیری نتائج مرتب ہونے کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے — اتنی تیز کہ کائناتی قانون کی رفتار سے جو نتائج صدیوں میں جاکر محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں، وہ اس رفتار کی رُو سے دنوں میں سامنے آجاتے ہیں۔ انسانی تاریخ میں یہ ادوار (خواہ ان کی مدت کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو) نشانِ منزل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ حق و باطل کی یہ کشمکش تاریخی وجوب، کی اندھی قوت کی رُو سے جاری نہیں۔ یہ خدائے علیم و حکیم کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق جاری ہے جس کی رُو سے کائنات بالحق اور بامقصد پیدا کی گئی ہے اور وہ ایک خاص منزل کی طرف رواں دواں جا رہی ہے۔ جب انسان حق کے مطابق نظام قائم کرنے کی کوشش چھوڑ دیتے ہیں تو وہ (حق) پھر کائناتی رفتار سے آگے بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ مستقل اقدار کی صحیح تعلیم و تربیت سے انسانوں کو ہر زمانے میں اس قابل بنایا جاسکتا ہے کہ وہ حق کا نظام قائم کرسکیں۔ تاریخ کے جن درخشندہ ادوار کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، وہ ادوار تھے جن میں انسانی جماعتوں کو اس قابل بنایا گیا تھا۔ آخری مرتبہ یہ دور محمد رسول اللہ والذین معہٗ کے زمانے میں آیا۔ جب تک اس صحیح تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رہا (جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے) وہ نظام قائم رہا۔ جب لوگوں نے اس سلسلہ کو منقطع کر دیا، تو وہ نظام بھی باقی نہ رہا۔ وہ مستقل اقدار جن کے مطابق یہ نظام قائم ہوا تھا، اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ ان میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ ہر زمانے میں عملی نظام کی شکل میں متشکل کی جاسکیں۔ جب اور جہاں بھی ان کی صحیح تعلیم کا سلسلہ جاری ہوگیا وہ نظام متشکل ہو جائے گا۔

ہم۔ ان چودہ سو سال کے عرصے میں جب کہ حق کا وہ نظام، جسے انسانی ہاتھوں نے قائم کیا تھا، باقی نہ رہا، حق پر مبنی تصورات، کائناتی رفتار سے باقاعدہ آگے بڑھتے چلے آرہے ہیں اور انسانی معاشرہ پر غیر شعوری طور پر مسلط ہوتے جا رہے ہیں — ملوکیت کا مٹ جانا اور اس کی جگہ شورائیت کے تصور کا عام ہو جانا۔ غلامی کا خاتمہ۔ ذات پات کی تمیز کا دور ہو جانا۔ قومیت کی جگہ عالمگیر انسانی برادری اور وحدتِ نظام انسانیہ کے تصور کا اجاگر ہوتے چلے جانا۔ انسانوں کے بنیادی حقوق کے احساس کا بیدار ہو جانا۔ زمینداری

جاگیرداری سرمایہ داری کے نظام کا منسوخ بن جانا اور عالمگیر نظامِ ربوبیت کا مقبول ہوتے چلے جانا وغیرہ وغیرہ ـــــ یہ سب قرائن و شواہد اس حقیقت کی دلیل ہیں کہ حق کے مطابق نظریاتِ زندگی، کائناتی قانونِ خداوندی کے مطابق آہستہ آہستہ متمکن ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اب دنیا کی کوئی قوت، اُن باطل تصورات کو واپس نہیں لا سکتی، جنہیں حق کے تصورات نے شکست دے کر میدان سے بھگا دیا ہے۔ اس وقت اگر انسانوں کی تعلیم و تربیت قرآنی تصورات کے مطابق کر دی جائے تو صحیح نظامِ عدل و صداقت کے قائم ہونے میں (جسے ہم خدا کے نظامِ ربوبیت کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں) کچھ دیر نہیں لگے گی۔ اس کے لئے کائناتی قانون نے فضا کو بڑا سازگار بنا دیا ہے۔

۵ - تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ اسلام کا نظریۂ حیات اور اشتراکیت کا فلسفۂ زندگی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یہی وجہ ہے جو ہم اکثر و بیشتر کہتے رہتے ہیں کہ نہ کوئی مسلمان کمیونسٹ ہو سکتا ہے اور نہ کوئی کمیونسٹ مسلمان ہو سکتا ہے۔ عام لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ جب اشتراکیت کے معاشی نظام کی بعض جزئیات اور قرآن کے معاشی نظام میں مماثلت دیکھتے ہیں تو جھٹ سے کہہ اٹھتے ہیں کہ اسلام اور اشتراکیت ایک ہی چیز ہے۔ اور یہ غلطی صرف اشتراکی نظام کے بارے میں ہی نہیں کی جاتی۔ ہر نظام کے بارے میں کی جاتی ہے۔ مثلاً جب لوگوں نے دیکھا کہ مغربی جمہوریت بھی ملوکیت کے خلاف ہے اور اسلام بھی ملوکیت کی جگہ نظامِ شورائیت کا حامی ہے تو انہوں نے فوراً اعلان کرنا شروع کر دیا کہ اسلام اور جمہوریت ایک ہی شے ہے۔ حالانکہ مغرب کی جمہوریت، جس مادی نظریۂ حیات کی پیداوار ہے وہ اسلامی نظریۂ زندگی کے یکسر خلاف اور اس کی نقیض ہے۔ اسی قبیل کا یہ نعرہ ہے (جسے آج کل مغربی سیاست خاص طور پر بلند کر رہی ہے) کہ چونکہ عیسائی دنیا بھی خدا کو مانتی ہے اور مسلمان بھی خدا پر ایمان رکھتے ہیں اس لئے یہ دونوں ایک ہیں۔ حالانکہ عیسائی دنیا جس چیز کو خدا پر ایمان قرار دیتی ہے، قرآن اسے کفر اور شرک سے تعبیر کرتا ہے اور واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ جب تک یہ لوگ خدا کو ان تصورات کے مطابق نہ مانیں، جنہیں قرآن کریم پیش کرتا ہے، وہ کبھی خدا کے ماننے والے نہیں کہلا سکتے۔ بہرحال یہ جملہ معترضہ تھا۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ اسلام کا نظریۂ زندگی اور اشتراکی فلسفۂ حیات ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

۶ - گزشتہ صفحات میں جو کچھ کہا گیا ہے، محترم مستفسر کے استفسارات کا اصولی جواب اسی میں آگیا ہے۔ لیکن ان کی بعض جزئی باتوں کے متعلق مختصراً ذیل میں عرض کیا جاتا ہے۔

(۱) انہوں نے کہا ہے کہ اسلام نے اپنے ابتدائی ایام میں تاریخ کے مادی تقاضوں سے ٹکر لی۔ اور ایک مخصوص خطہ میں ایسا نظام قائم کر دکھایا جو اس زمانے کے طبعی تاریخی دور سے الگ تھا

اس کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ "یہ پیغمبر اسلام کی بے پناہ روحانیت کا کرشمہ تھا اور ایک معجزہ"۔

محترم مستفسر یا تو پورے طور پر اشتراکی فلسفہ کے قائل نہیں۔ یا (معاف فرمائیے) انہیں پورے طور پر اس کا علم نہیں۔ اشتراکی فلسفہ کی رو سے نہ "روحانیت" کوئی شے ہے۔ اور نہ ہی اس پر مبنی معجزہ کا کوئی وجود۔ جب تاریخ کی تعبیر یکسر مادی ہے تو اس میں روحانیت کا ذکر ہی کیا۔ مارکس، اس قسم کے تصورات کو انسانی اوہام کی پیداوار قرار دیتا ہے۔ پھر یہ چیز بھی قابلِ غور ہے کہ جب تاریخی وجوب کی قوت ایسی بے پناہ ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کے دھارے کو نہیں روک سکتی، تو دنیا کے کسی ایک .... خطہ ہی میں سہی اور تھوڑے سے وقت کے لئے ہی سہی۔ جب اس دھارے کا رخ موڑ دیا گیا اور اس کے علی الرغم ایک نظام قائم کر کے دکھا دیا گیا تو وہ بنیاد ہی منہدم ہو گئی جس پر اشتراکی فلسفہ کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ذرا عام روش سے ہٹ کر سوچا جائے تو یہ بات ابھر کر سامنے آجائے گی کہ جسے "تاریخی وجوب" کہا جاتا ہے، اس کی اصل ہی کچھ نہیں۔ وہ تو قرآن کے الفاظ میں "ان ناموں میں سے ایک نام ہے، جنہیں تم نے یا تمہارے آباء و اجداد نے وضع کر لیا تھا"۔ محض ایک نام۔۔۔ تاریخ، انسانوں کے اختیار ارادہ اور اعمال و کردار کی داستان کا نام ہے۔ اسے ایک ایسی مہیب قوت سمجھ لینا جس کے سامنے انسان بے دست و پا، اور محکوم و مقہور بن کر رہ جائے، پتھر کو دیوتا بنا لینے والی بات ہے۔ مارکس نے خدا سے انکار کیا۔۔۔ اور اس کا سبب اُسے جس خدا کا پرستار بنانا چاہتا تھا وہ خدا تھا ہی اس قابل کہ اس سے انکار کر دیا جاتا۔۔۔ اس خدا سے اس نے انکار کیا اور حقیقی خدا کا تصور اس کے سامنے کسی نے پیش نہ کیا۔ نتیجہ یہ کہ اس کے ذہن میں خلا پیدا ہو گیا۔ لیکن چونکہ خلا کا قائم رہنا ناممکنات سے ہے اس لئے اسے اس خلا کو پورا کرنے کے لئے "ایک خدا" وضع کرنا۔ یہ خدا ہے "تاریخی وجوب" جو محض ایک موہوم نام ہے۔ اس کی اصل و حقیقت کچھ بھی نہیں۔ کوئی کمیونسٹ آج تک یہ نہیں سمجھا سکا کہ "تاریخی وجوب" ہے کیا؟ نہ ہی خود مارکس کے ہاں اس کی تشریح ملتی ہے۔

باقی رہا یہ کہ جو نظام رسول اللہؐ نے قائم فرمایا تھا وہ تھوڑے عرصے کے بعد جاری کیوں نہ رہا، سو اس کے متعلق گذشتہ صفحات میں مختصراً بتایا جا چکا ہے۔ (تفصیلاً دیکھنا ہو تو سلیم کے نام خطوط کی تیسری جلد میں وہ خط دیکھئے جس کا عنوان ہے "اسلام آگے کیوں نہ چلا")۔

اس مقام پر اتنا اور بتا دینا ضروری ہے کہ جو نظام نبی اکرمؐ نے قائم فرمایا تھا وہ نہ معجزہ تھا نہ "روحانیت" کا کرشمہ۔ وہ اس پروگرام کا فطری نتیجہ تھا۔ جسے قرآن کریم نے اس نظام کے قیام کے لئے تجویز کیا ہے۔ یعنی صحیح تعلیم و تربیت سے مستقل اقدار کی اہمیت کو اس قدر دلوں میں جاگزیں کر دینا کہ وہ انسانی زندگی کا

نصب العین بن جائیں اور اس طرح انسان ان کے تحفظ کی خاطر ہر قسم کی مادی قربانی کے لئے بطیب خاطر تیار ہو جائے۔ اس پروگرام پر جب بھی عمل کیا جائے گا اس کا نتیجہ وہی برآمد ہوگا جو نبی اکرمؐ کے زمانے میں پیدا ہوا تھا۔ یہ بھی واضح ہے کہ قرآن کریم نے اس نظام کے اصول دئے ہیں جو غیر متبدل ہیں۔ اس کی جزئیات خود متعین نہیں کیں۔ انہیں ہر زمانے کے انسانوں پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ انہیں اپنے حالات کے مطابق خود متعین کریں۔ اس لئے محترم مستفسر کا یہ سمجھنا کہ کسی ایک زمانے کی متعین کردہ جزئیات بھی ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گی، قرآنی تصورِ نظام سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ خود نبی اکرمؐ کے جانشینوں (خلفائے راشدین) کے زمانے میں کئی ایک جزئیات میں جو پہلے متعین ہوئی تھیں تبدیلی کی گئی۔ ان میں سے جو علیٰ حالہٖ رہنے دی گئیں تو اس لئے کہ ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

(۱۱) محترم مستفسر نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ ناممکن ہے کہ بچہ پیدا ہوتے ہی بڑھاپے کی عمر میں پہنچ جائے۔ تدریجی ارتقاء فطرت کے اصولوں میں سے ہے۔

یہ درست ہے لیکن اس اصول کا اطلاق انہی امور پر ہو سکتا ہے جو انسانی ذہن کے پیدا کردہ ہوں۔ آج سے چھ ہزار سال پہلے کا انسانی ذہن وہ باتیں نہیں سوچ سکتا تھا جو آج کا ذہن سوچ سکتا ہے۔ لیکن وحی خداوندی انسانی ذہن کی تخلیق نہیں ہوتی۔ اس کا سرچشمہ علم خداوندی ہے جو ماحول کے اثرات سے بلند ہے۔ وحی انسان کو ابدی حقائق دیتی ہے جو مستقل بالذات اور غیر متبدل ہیں۔ وحی کے سب سے پہلے نبی نے بھی یہی کہا تھا کہ لوگوں سے کہہ دو کہ ذرائع رزق انسانی نشوونما کے لئے ہیں، انہیں افراد اور مخصوص گروہوں کی مفاد پرستیوں کے لئے محدود نہیں کیا جا سکتا۔ ذہن انسانی اور وحی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ذہن انسانی کا طریق تجرباتی ہے۔ اس لئے وہ تدریجاً حقیقت تک پہنچتا ہے۔ لیکن وحی خداوندی پہلے ہی دن حقیقت کو سامنے لے آتی ہے۔ البتہ اس حقیقت کو عملی نظام میں منتقل کرنے کے لئے ہر دور کے تقاضوں کو سامنے رکھا جائے گا اور یہ سب کچھ انسانی جد وجہد کی رو سے ہوگا۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے وحی کی رو سے اس نظام کے اصول ملتے ہیں۔ جزئیات نہیں ملتیں۔ تدریجی ارتقاء کا عمل انسانی زندگی کی جزئیات میں ہوتا ہے۔ اصولوں میں نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ بچے کی مختلف قوتوں کی نشوونما تدریجاً ہوتی ہے لیکن جن اصولوں پر انسانی زندگی کا دار و مدار ہے" وہ بچپن، جوانی اور بڑھاپے میں یکساں رہتے ہیں۔ مثلاً زندگی کا دار و مدار سانس پر ہے تو یہ چیز زندگی کے پہلے دن سے آخری دن تک یکساں طور پر کارفرما رہتی ہے۔ اسی طرح زندگی اور صحت سے متعلق دوسرے اصولوں کی کیفیت ہے یہ اصول تدریجاً مرتب نہیں ہوتے۔ جس نے زندگی دی ہے" اسی نے ان اصولوں کو مستقل طور پر متعین کر دیا ہے۔ جو ان اصولوں میں تغیر و تبدل کرتا ہے وہ نقصان اٹھاتا ہے۔

جس طرح زندگی کے خالق نے طبعی زندگی کے لئے اصول دئے ہیں اسی طرح اس نے انسان کی تمدنی زندگی کے لئے بھی اصول دئے ہیں۔ یہ اصول بھی اسی طرح غیر متبدل ہیں جس طرح طبعی زندگی سے متعلق اصول۔ تدریجی ارتقا کا سوال نہ ان میں ہے نہ آن میں۔ پھر جس طرح طبعی زندگی سے متعلق اصول انسانی ذہن کی پیداوار نہیں۔ اسی طرح اس کی تمدنی زندگی سے متعلق اصول بھی اس کے ذہن کی پیداوار نہیں ہو سکتے۔ کائنات کی کسی چیز نے بھی اپنے لئے اصول آپ وضع نہیں کئے۔ سب "وحی" کی رُو سے طے ہیں۔

(iii) محترم مستفسر نے، اشتراکی فلسفہ کی ایک بنیادی کمزوری کو نظر انداز کر دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب (مثلاً) تاریخی وجوب کی رُو سے اب وقت آ گیا ہے کہ سابقہ نظام سرمایہ داری کی جگہ اشتراکی نظام دُنیا پر مسلط ہو جائے تو اس کے لئے نہ کسی جد وجہد کی ضرورت ہے نہ کد و کاوش کی حاجت۔ "تاریخی وجوب" کی بے پناہ قوت اس جدید نظام کو خود بخود مسلط کر دے گی۔ دنیا کی کوئی طاقت اس کے دھارے کے سامنے روک بن کر کھڑی نہیں رہ سکتی۔ یہ اسے خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گی۔

جب صورت حال یہ ہے تو پھر اشتراکی ممالک، اشتراکیت کو پھیلانے اور مسلط کرانے کے لئے اس قدر تعل برآتش کیوں رہتے ہیں ـــــ یہ اس قدر پراپیگنڈے کا طوفان مختلف ممالک میں دہشت پسند جماعتیں سرمایہ دارانہ نظام کی حامل سلطنتوں کے خلاف سرد اور گرم جنگ کا سلسلہ۔ اس قدر سپاہ۔ اتنا عظیم سامان جنگ۔ ایٹمی بم وغیرہ وغیرہ کس مقصد کے لئے ہیں۔ کیا "تاریخی وجوب" اس قدر کمزور ہو چکی ہے کہ اسے ان سہاروں کی ضرورت پڑ رہی ہے۔ اور ضرورت پڑ رہی ہے ان انسانوں کے مقابلے کے لئے جو اشتراکی فلسفہ کے مطابق نہایت بے بس اور مجبور ہیں۔

اس فلسفہ کی دوسری کمزوری یہ ہے کہ (مثلاً) آج کل جدلی جنگ کی رُو سے اشتراکی نظام کے مسلط ہونے کی باری ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کے بعد جب اسی جنگ کے مطابق اشتراکی نظام کی ضد، دوسرے نظام (یعنی نظام سرمایہ داری) کے مسلط ہونے کی باری آئیگی تو اس وقت اس فلسفہ کے معتقدین کا طرز عمل کیا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ اس وقت انہیں نظام سرمایہ داری کا حامی ہونا پڑے گا۔ اور اشتراکی نظام کے خلاف وہی کچھ کرنا ہوگا جو کچھ وہ اس وقت نظام سرمایہ داری کے خلاف کر رہے ہیں۔ اس وقت وہ تمام لٹریچر جس میں نظام سرمایہ داری کو نوع انسان کے لئے لعنت قرار دیا گیا ہے، نذر آتش کر دینا پڑے گا۔ اور وہ تمام دلائل جو اس وقت نظام اشتراکی کے حق میں دی جاتی ہے خود ان کی تردید کرنی پڑے گی۔ اس وقت سب سے بڑا سرمایہ دار سب سے زیادہ مستحق تبریک و تہنیت قرار دیا جائے گا۔

پھر اسی نقشہ کو ذرا پیچھے کی طرف لے لیجئے۔ موجودہ دور سے پہلے، نظام سرمایہ داری، "تاریخی وجوب" کے تقاضے

کے عین مطابق تھا۔ سوال یہ ہے کہ آپ اُس دور کے سرمایہ پرستوں کو موجب لعنت و ملامت کیوں قرار دیتے ہیں؟ ان کی شان میں قصائد کیوں نہیں لکھتے۔ آپ اُس "مذہب" کو "افیون" کیوں قرار دیتے ہیں جو اُس وقت اُس نظام کی تائید کرتا تھا۔

آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کا طرزِ عمل کس طرح فلسفۂ وجوب تاریخی کے خلاف ہے؟ اگر آپ اس فلسفہ کو فی الواقعہ سچا سمجھتے ہیں تو آپ کو سابقہ دور کے سرمایہ پرستوں کی مدح میں قصیدے پڑھنے چاہئیں کہ انہوں نے تاریخی وجوب کا ساتھ دیا تھا۔ نیز اُس زمانے کے مذہب کو سچا مذہب قرار دینا چاہئے جس نے تاریخی وجوب کی تائید کی تھی۔ اسی طرح آپ کو اس دور کے بعد بھی اُس مذہب کو حق و صداقت کا مذہب سمجھنا چاہیئے۔ جو نظامِ سرمایہ داری کی تائید کرے۔ کیونکہ اُس وقت تاریخی وجوب کا یہی تقاضا ہوگا۔

آپ مذہب پرست طبقہ کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔ آنکھیں بند کئے اپنے معتقدات پر جمے رہتے ہیں اور جو شخص ان کے خلاف کچھ کہے اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اس کا نام آپ کے نزدیک مذہبی جنون (FANATICISM) ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ جو مانتے ہیں کہ نظامِ اشتراکیت بہترین نظام ہے تو کیا آپ اس نتیجہ پر عقل و فکر کی رُو سے پہنچے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ یہ محض اتفاق ہے کہ آپ اُس دور میں پیدا ہوئے جب تاریخی وجوب کی رُو سے اشتراکی نظام کی باری آئی۔ آپ نے اس نظام کی تائید شروع کر دی۔ اگر آپ چند صدیاں پہلے پیدا ہوتے تو تاریخی وجوب کے معتقد کی حیثیت سے آپ نظامِ سرمایہ داری کو عین حق و صداقت کے مطابق نظام قرار دیتے۔ سوچئے کہ یہ مذہبی جنون نہیں تو اور کیا ہے؟ اور جنون بھی اس شدت کا کہ جو شخص آپ کے اس عقیدہ سے متعلق نہیں آپ اُسے زندہ رہنے کا حق تک دینے کے لئے تیار نہیں۔

اس کے مقابلہ میں دینِ خداوندی کو دیکھئے کہ اس نے پہلے دن سے ایک نظام (ربوبیت) کو حق و صداقت کا نظام قرار دیا۔ اور آج تک اُسی کو حق و صداقت کا نظام قرار دئے چلا جاتا ہے۔ اور ہمیشہ تک اسے ہی حق و صداقت پر مبنی نظام قرار دے گا۔ آپ سوچئے کہ جو لوگ اس نظام کے مؤید ہیں ان کا موقف علم و بصیرت اور دلائل و براہین پر مبنی سمجھا جائے گا یا تاریخی وجوب کے معتقدین کا، جنہیں ہر دور میں اپنے سابقہ موقف کے خلاف کہنا اور کرنا پڑے گا۔ یہ فرق ہے وحی خداوندی اور انسانی ذہن کے وضع کردہ نظریاتِ حیات میں!

(۱۷) محترم مستفسر یہ بھی لکھتے ہیں کہ اسی قرآن سے پرویز صاحب نظامِ ربوبیت ثابت کرتے ہیں اور اسی سے مودودی صاحب نظامِ سرمایہ داری کی تائید لاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے ہیں کہ

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں

محترم مستفسر جس خدا سے پوچھتے ہیں کہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں، اس خدا نے ان سادہ دل بندوں

کو پہلے ہی بتا رکھا ہے کہ وہ کدھر جائیں۔ اس نے کہا ہے کہ تم نہ یہ دیکھو کہ پرویز کیا کہتا ہے اور نہ یہ کہ مودودی کیا کہتا ہے، میری کتاب گیتا وید یا "نہیں کہ کسی کی سمجھ میں ہی نہ آئے۔ تم اس کتاب کو اپنی عقل وفکر کی رو سے دیکھو اور سمجھو بات صاف ہو جائے گی۔ اسی سے یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ مسلمانوں کے ممالک میں اس وقت کیا ہو رہا ہے۔ اور جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ذمہ داری قرآن کی تعلیم پر ہے یا انسانوں کا خود ساختہ مذہب ہے جسے بدقسمتی سے اسلام کا نام دے دیا گیا ہے۔

(۷) محترم مستفسر نے کہا ہے کہ ہمیں آگے بڑھنے کے لئے تاریخ کے مادی اصولوں ہی سے راہنمائی لینی چاہیئے اور اپنے اردگرد کے حالات سے اور تجربوں سے فائدہ اٹھانا چاہیئے نظام ربوبیت تک پہنچنے کے لئے سیدھا راستہ یہی ہے"

ہم سمجھ نہیں سکے کہ اس سے ان کا مطلب کیا ہے؛ یہ بات اگر وہ اس مذہب پرست طبقہ سے کہتے جو نظام سرمایہ داری کو مقدس سمجھتا ہے تو قابل فہم ہوتی۔ لیکن نظام ربوبیت کے داعیان سے یہ کہنا، کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سے ان کی مراد وہ چیز ہے جسے وہ اپنے خط کے شروع میں بیان کر چکے ہیں۔ یعنی یہ کہ "نظام ربوبیت سے جو آپ کی غایت ہے وہ بالکل درست ہے لیکن ذرائع حصول میں مجھے اختلاف ہے" انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ ان کے نزدیک اس مقصد کے حصول کے ذرائع کیا ہیں۔ نہ ہی ہمیں ایسا فرض کر لینے کا حق حاصل ہے کہ یہ صاحب واقعی اشتراکی ہیں، اس لئے ان کے پیش نظر وہی ذرائع ہیں جنہیں اشتراکی لیڈر اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ممکن ہے ان کے پیش نظر کوئی اور ذریعہ ہو۔ لیکن جہاں تک اشتراکی نظام کا تعلق ہے، اس کے نزدیک اپنے مقصد کے حصول کے جو ذرائع ہیں وہ ہمارے سامنے ہیں۔ لینن اس باب میں کہتا ہے کہ

ہم ان تمام اخلاقی حدود وشرائع کی مذمت کرتے ہیں جو کسی مافوق الفطرت عقیدہ کا نتیجہ ہوں ہمارے خیال میں اخلاق کا نظریہ ہمیشہ جماعت کے مفاد کی جنگ کے ماتحت ہونا چاہیئے۔ ہر وہ حربہ جو قدیم غاصبانہ نظام معاشرت کے خلاف اور مزدوروں کی تنظیم کی تائید میں ضروری سمجھا جائے عین اخلاق ہے۔ چنانچہ جماعتی مفاد کی خاطر، جرائم کا ارتکاب، دروغ بافی۔ فریب دہی، عین حق و صداقت ہے۔

اب رہا طریق کار۔ سو اس کے متعلق لینن لکھتا ہے کہ

سرمایہ داری نظام حکومت کی جگہ اشتراکی حکومت کا برسر اقتدار آ جانا تشدد آمیز انقلاب کے بغیر ناممکن ہے[1]

---

[1] حوالوں کے لئے دیکھئے۔ سلیم کے نام خطوط۔ جلد اول، آٹھواں خط

ظاہر ہے کہ اسلام کی رُو سے ان ذرائع کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاقی حدود وہ مستقل اقدار ہیں جنہیں کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام، ذریعہ اور مقصد میں فرق ہی نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک غلط راستہ کبھی صحیح منزل تک نہیں پہنچا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ نظامِ ربوبیت بھی اس کے نزدیک مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اور وہ مقصد ہے انسانی ذات کی نشوونما۔ اور انسانی ذات کی نشوونما کی صورت یہ ہے کہ جہاں کوئی مستقل قدر ہاتھ سے چھوٹی، نشوونما رُک گئی۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ زندگی کی بعض ضروریات کے لئے جھوٹ بولنا شرعاً جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہے" تو یہ خالص میکیاؤلی سیاست ہے جسے شریعتِ خداوندی سے کوئی واسطہ نہیں۔

باقی رہا تشدد کے ذریعہ انقلاب لانا تو قرآن کی رُو سے، اس طرح فساد تو برپا کیا جا سکتا ہے، انقلاب نہیں لایا جا سکتا۔ اس کے نزدیک خارج میں انقلاب آ نہیں سکتا جب تک انسان کے قلب میں انقلاب پیدا نہ ہو، اور قلب میں انقلاب، صحیح تعلیم و تربیت کے ذریعہ پیدا ہو سکتا ہے۔ نبی اکرمؐ جو انقلاب لائے تھے تو اس کا ذریعہ "تعلیم کتاب و حکمت" ہی تھا۔ اس سے حضورؐ نے اپنی جماعت کے قلب و نگاہ میں ایسا انقلاب پیدا کر دیا جس سے ان کی نظروں میں زندگی کی اقدار بدل گئیں۔ تشدد کے ذریعے جس قسم کا انقلاب آتا ہے اس کا مزہ خود روس نے چکھ لیا ہے۔ ....

...... اسٹالن کا دور، تشدد کا سخت ترین دور تھا۔ اب روس میں اس دور کے ہیرو اسٹالن کی لاش تک کو اکھاڑ کر پھینک دیا گیا ہے۔ اور اس دور کے تشدد کی ہولناک داستانوں کو بار بار دُہرا کر لوگوں کے دل میں اس کے خلاف نفرت و انتقام کے جذبات بھڑکائے جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مادی نظریۂ حیات کی رُو سے، انقلاب کے لئے تشدد کے علاوہ اور کوئی ذریعہ کارگر ہو نہیں سکتا۔ لیکن قرآنی نظریۂ زندگی کی رو سے احترامِ انسانیت، انسانی ذات پر ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔ یہ ظلم و استبداد کی قوتوں کی دراز دستیوں کو روکنے کے لئے تو قوت کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ نظریۂ زندگی کی تبدیلی کے لئے قوت کے استعمال کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے کہ قوت کے استعمال سے نظریہ میں تبدیلی نہیں آ سکتی۔ یہ تبدیلی، یقین (CONVICTION) سے آتی ہے اور (CONVICTION) کی بنیاد، دلائل و براہین کی رُو سے دل و دماغ کے اطمینان پر ہے۔ اسی کو قرآن کی اصطلاح میں ایمان کہتے ہیں۔ یہی ایمان وہ جذبۂ محرکہ (INCENTIVE) عطا کرتا ہے جو انسان کو اس پر آمادہ کر دیتا ہے کہ وہ خون پسینہ ایک کر کے زیادہ سے زیادہ کمائے اور اس میں سے بقدر اپنی ضروریات کے لے کر باقی سب بطیبِ خاطر، دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدے۔ مادی تاریخ، انسان کے اندر اس قسم کا

جذبہ پیدا کر ہی نہیں سکتی۔ اور یہی وہ چٹان ہے جس پر اشتراکیت کی کشتی اس بُری طرح سے ٹوٹی ہے کہ انہیں اس کی شکست و ریخت کو دُنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کے لئے وہاں آہنی پردے لٹکانے پڑ گئے ہیں۔ اس کے برعکس جب اسلامی نظام قائم ہوتا ہے تو وہ دنیا بھر کے انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اس کے مرکز (کعبہ) میں آئیں۔ (لیشھدوا منافع لہم) اور اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ وہ ان کی نفع بخشیوں کے لئے کیا کچھ کرتا ہے۔

یہ ہے فرق اسلام کے طریق کار اور اشتراکیت کے طریق کار میں۔

(۷) محترم مستفسر نے لکھا ہے کہ اس وقت دنیا کے تمام مسلم ممالک، اسلامی نظام کی مخالف سمت کو جا رہے ہیں۔ اس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلامی نظام صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس نتیجہ کے اخذ کرنے کے لئے یہ دلیل جس قدر کمزور ہے وہ ظاہر ہے۔ محترم مستفسر اس سے متفق ہوں گے کہ اس وقت دُنیا کی اکثریت، اشتراکی نظام کی مخالف ہے۔ کیا وہ اسے ماننے کے لئے تیار ہیں کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اشتراکی نظام صحیح نہیں۔ کسی نظام کے صحیح یا غلط ہونے کی یہ دلیل نہیں کہ کتنے لوگ اس کے موافق ہیں اور کتنے مخالف۔ اس بات کے پرکھنے کا صحیح طریق یہ ہے کہ اس نظام پر علم و بصیرت کی رُو سے غور کیا جائے اور دلائل و براہین کی رو سے کسی نتیجہ پر پہنچا جائے۔ قرآن اپنے ہر دعوے کو علیٰ وجہ البصیرت پیش کرتا ہے اور دلائل کی رُو سے منواتا ہے۔ وہ اپنے مخالفین سے بھی یہی کہتا ہے کہ تم اپنے دعویٰ کی تائید میں دلائل پیش کرو۔ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن کریم کا پیش کردہ نظام ربوبیت نوع انسان کی منفعت کا ضامن ہے اور اس کے سوا دنیا کا کوئی نظام یہ نتیجہ نہیں پیدا کر سکتا۔ ہم اپنے اس دعوے کو علم و بصیرت کی رُو سے پیش کرتے ہیں اور اگر کوئی اس سے انکار کرتا ہے تو اس سے ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ وہ اپنے دعوے کو علم و بصیرت کی رو سے پیش کرے۔

آخر میں ہم محترم مستفسر کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ اسے حُسنِ اتفاق سمجھئے کہ اس وقت آپ کے خیال کے مطابق، تاریخی وجوب کا تقاضا بھی وہی ہے جس کی طرف قرآن دعوت دیتا ہے۔ سوال اس فلسفۂ زندگی کے اختلاف کا ہے جس پر یہ دونوں نظام متفرع ہیں۔ اگر آپ اس نظام کو قرآنی فلسفۂ زندگی کی رُو سے اختیار کریں گے تو اس سے کم از کم اتنا فائدہ تو ضرور ہو گا کہ کل کو جب، تاریخی وجوب کی اٹل گردش کے مطابق، پھر سے نظام سرمایہ داری کی باری آگئی تو اس وقت آپ کو یہ خفت نہیں اٹھانی پڑے گی کہ جس اشتراکی نظام کو آپ کل تک نوع انسان کی فلاح و بہبود کا ضامن قرار دیتے تھے، اسے نوع انسان

کی تباہی و بربادی کا موجب ٹھہرانا پڑے۔ قرآن یہ کبھی نہیں کرے گا کہ جس بات کو وہ آج نوع انسان کی منفعت کا موجب بتائے اسے کل کو انسانیت کی تباہی کا باعث قرار دے دے۔ اس کے اصول ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ وہ "تاریخی وجوب" کی گردش دولابی سے ہر زمانے میں بدلتے نہیں رہتے۔ نکتہ کو ذرا اشتراکی نظام کی تاریخ کی روشنی میں دیکھئے۔ مارکس نے اپنے تصور کو ایک عالمگیر نظام کی حیثیت سے پیش کیا اور لینن کے زمانے تک اسے ایسا ہی سمجھا جاتا رہا۔ لیکن اسٹالن نے اس کی عالمگیر حیثیت کو ختم کرکے، قومی حیثیت دے دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب یہ نظام روس کا قومی نظام بن کر رہ گیا۔ اب اس نظام کی جنگ دوسرے نظاموں سے نہیں رہی۔ اب روس کی جنگ دیگر ممالک سے ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روس کو انہی سرمایہ دارانہ نظام کے حامل ممالک سے دوستی کے معاہدات کرنے پڑ رہے ہیں۔ جس نظام کے خلاف اشتراکی نظام صدائے احتجاج بن کر اٹھا تھا اور اسی کے خلاف ان ممالک سے تعلقات منقطع کرنے پڑ رہے ہیں جو خود اشتراکی نظام کے داعی ہیں۔ یہ نتیجہ ہے مستقل اقدار پر ایمان نہ ہونے کا۔ اس کے برعکس قرآن کریم زندگی کا جو نظام پیش کرتا ہے اس کے بنیادی اصول یہ ہیں کہ (۱) ہر انسان، محض انسان ہونے کی حیثیت سے واجب التکریم ہے۔ (۲) نظام وہی حق و صداقت پر مبنی سمجھا جا سکتا ہے۔ جس کے پیش نظر کسی خاص ملک۔ خاص قوم۔ خاص گروہ اور خاص پلٹی کا مفاد نہ ہو بلکہ پوری کی پوری انسانیت کا مفاد ہو۔ (۳) دنیا میں "اپنوں" اور "بیگانوں" کی تمیز اور تفریق کا معیار یہ ہے کہ جو لوگ قرآنی نظام کی صداقت پر ایمان رکھیں وہ اپنے ہیں جو اس کے مخالف ہوں وہ بیگانے ـــــ خواہ وہ روس کے اشتراکی ہوں یا امریکہ کے جمہوریت نواز۔ (۴) اس نظام کی بنیاد اس ایمان پر ہے کہ زندگی اسی دنیا کی زندگی نہیں۔ موت کے بعد بھی آگے چلتی ہے اور انسان کا ہر ارادہ اور عمل اپنا نتیجہ پیدا کرکے رہتا ہے ـــــ خواہ وہ اس زندگی میں سامنے آئے یا اس کے بعد۔ اسی تصور کو بالفاظ دیگر یوں بیان کیا جاتا ہے کہ انسان اپنے ہر عمل بلکہ ہر ارادہ تک کے لئے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔

یہ اصول غیر متبدل ہیں اور کسی دور کے کسی "اسٹالن" کو اس کا اختیار نہیں کہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی کر سکے ـــــ ہم پوچھنا چاہتے ہیں جناب مستفسر سے کہ کیا نوع انسان کے امن و فلاح کا ضامن اس قسم کا نظام ہو سکتا ہے یا اشتراکی نظام!

کیا آپ کو معلوم ہے کہ طلوع اسلام پاکستان کے علاوہ ۲۴ غیر ممالک میں بھی پڑھا جاتا ہے وہ کاروباری حضرات یورپ، امریکہ، افریقہ وغیرہ میں اپنی مصنوعات کو روشناس کرانا چاہتے ہیں طلوع اسلام میں اشتہار شائع کرائیں۔

پٹ سن کی مصنوعات تیار کرنیوالوں میں

★ ایک ممتاز اور نمایاں مقام کے حامل ★

لطیف باوانی جوٹ ملز لمیٹڈ

ڈھاکہ

اس ادارہ کے تیار کردہ تھیلے - بوریاں - سوتلیاں اور ٹاٹ کی دیگر اشیاء دنیا کے مختلف گوشوں میں بھیجے جاتے ہیں اور دنیا کے ہر حصے میں ویسے ہی مقبولِ عام ہیں جیسے اپنے گھر میں۔

منیجنگ ایجنٹس :-

احمد برادرز لمیٹڈ ۳۵-۳۶ جناح ایونیو - رمنا — ڈھاکہ (۲)

تار کا پتہ :- "باوانی" — فون نمبر ۲-۶۷۳۱

کراچی آفس — بینک ہاؤس حبیب اسکوائر - بندر روڈ کراچی

نقد و نظر

مکاتیب سرسید احمد خاں

(شائع کردہ:- اسٹار بکڈپو — اردو بازار — لاہور)

پانچ سو صفحات پر مشتمل یہ ادسط سائز کی کتاب سرسید (علیہ الرحمہ) کے ان خطوط پر مشتمل ہے جو انہوں نے ۱۸۶۲ء سے لے کر اپنے ساتھ رحلت تک اپنے ممتاز احباب، عمائدینِ سلطنت اور مدیرانِ جرائد کو لکھے۔ کم و بیش ۳۵ سال کا یہ دور مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی بازآفرینی میں دورِ اوّل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس دور میں سرسید کو ایک عظیم داعیٔ انقلاب، ایک صاحبِ عزم معمار اور ملتِ اسلامیہ کے ممتاز ترین قائد کی حیثیت حاصل تھی۔ ایک طرف وہ اپنی شکست خوردہ اور دم توڑتی قوم کو نئی زندگی کا سراغ دے رہے تھے دوسری طرف اس کی نشاۃ ثانیہ کے لئے وہ انگریز حکمرانوں اور برادرانِ وطن سے چومکھی جنگ لڑ رہے تھے اور تیسری جانب ان کے ہاتھوں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی بنیادیں اٹھ رہی تھیں۔ اور یہ عظیم قومی درسگاہ ابھرتی ہوئی نئی نسل کی اُمنگوں اور عزائم کا مرکز و محور قرار پا رہی تھی۔ بالفاظِ دیگر اس برصغیر کے مسلمانوں کے مستقبل کی تعمیر کا ہر پروگرام اور ہر منصوبہ سرسید کے حُسنِ تدبر اور مومنانہ فراست کے گرد گھوم رہا تھا۔

یہ تھا اس دور میں سرسید کا مقام و منصب اور یہ تھیں اس کی عظیم ذمہ داریاں جن کے تقاضوں کے پیشِ نظر اس نے حسبِ ضرورت متعلقہ حلقوں سے سلسلۂ مراسلت قائم رکھا۔ مولوی مشتاق حسین کی یہ سعی و کاوش مستحق تبریک ہے کہ انہوں نے اس سلسلۂ مراسلت کی اس قدر کڑیوں کو مختلف مقامات سے حاصل کر کے انہیں یکجا کر دیا اور اس طرح سرسید کی سیرت و کردار کا ایک نمایاں پہلو ان خطوں کی وساطت سے منظرِ اشاعت پر آ گیا۔ ان خطوط میں اکثر سرسید کے ممتاز احباب اور رفقائے کار کے نام ہیں۔ کچھ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے سکرٹری صاحبان کے نام۔ کچھ اخبارات کے ایڈیٹروں کے نام، کچھ اپنے مخالفین

کے نام اور کچھ اسلامی انجمنوں سے متعلق ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس مجموعہ میں اکثر خطوط گویا کاروباری نجی اور رسمی قسم کے ہیں لیکن بہت سے ایسے بھی ہیں جن سے سرسیدؒ کے نظریات و تصورات، مقاصد و عزائم، فکر و بصیرت اور بلند نگہی و وسیع القلبی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے راجہ جے کشن داس کے نام ان کا ایک اہم خط ہمارے سامنے آتا ہے راجہ صاحب موصوف سرسیدؒ کی علی گڑھ میں قائم کردہ "سائنٹفک سوسائٹی" کے سکریٹری اور اسی نام سے جاری کردہ اخبار کے مہتمم تھے۔ ۱۵ر نومبر ۱۸۶۹ء کو سرسیدؒ نے انہیں لندن سے یہ خط لکھا تھا اور اس طویل خط میں وہاں کے معاشرے کی خوبیاں بیان کرنے کے بعد راجہ صاحب کو ایک اہم معاملے کی طرف یوں متوجہ فرماتے ہیں۔

> مجھ کو اس بات کے دریافت ہونے سے کہ حضور لفٹیننٹ گورنر بہادر نے سوسائٹی کی بڑی دستگیری کی ہے۔ اور صاحب ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن بہادر اضلاع شمال و مغرب نے بھی بڑی امداد اور پرورش فرمائی ہے، نہایت خوشی ہوئی مگر اے مائی ڈیر راجہ! اپنی سوسائٹی اور اخبار کی آزادی کو ہرگز ہاتھ سے مت جانے دینا۔ سررشتہ تعلیم کی بُرائی اور بھلائی پر تمام ہندوستان کی زندگی اور موت منحصر ہے۔ نہایت غور کی نگر منصفانہ نگاہ سے اس کو دیکھتے رہنا۔ صرف سچائی اور عوام کی بھلائی کو اپنا دوست جاننا۔　　(ص ۳۶)

سرسید اپنے ان مخالفوں بلکہ دشمنوں تک کے لئے جنہوں نے ان کے خلاف تکفیر کی مہم چلائی کس قدر فراخدل واقع ہوئے تھے۔ اس کا اندازہ ان کے اس خط سے بخوبی ہو سکے گا جو انہوں نے ۲۰ر مئی ۱۸۸۱ء کو اپنے عزیز دوست مولوی سید ممتاز علی کو علی گڑھ سے لکھا تھا۔ اس میں وہ بطور نصیحت لکھتے ہیں۔

> مولوی محمد حسین صاحب کچھ ہی کہتے اور لکھتے ہوں، ہمارا اور ہمارے دوستوں کا طریقہ ان کے ساتھ اخلاق اور ادب کا رہنا چاہیئے۔ وہ ذی علم اور قابل ادب ہیں۔ ہمارا مشرب محبت ہے۔ ہمارے دل میں رنج کو جگہ نہ ہونی چاہیئے۔ تحریر میں جو وہ بد تہذیبی کرتے ہیں اس سے ہمارا کیا نقصان ہے بلکہ اگر افسوس ہے تو یہ ہے کہ وہ اپنے اخلاق کو بٹہ لگاتے ہیں۔　　(ص ۱۵۴)

یہ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی وہی بزرگ ہیں جنہوں نے سرسیدؒ کے خلاف منافرت اور اشتعال پھیلانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا اور سرسیدؒ تھے کہ اپنے دوستوں کی طرف سے بھی ان کے خلاف کچھ لکھنا گوارا نہیں کرتے تھے۔

اسی طرح ۲۴ر جون ۱۸۸۱ء کو انہوں نے "پنجابی اخبار" کے ایڈیٹر عبداللطیف صاحب کے

نام ایک خط میں یہ تحریر فرمایا کہ

میں اپنے ان نامہربان دوستوں کا، جو میری ذاتی مخالفت پر سرگرم ہیں اور گو کہ وہ ان باتوں میں جو میری ذات سے علاقہ رکھتی ہیں کتنا ہی مبالغہ کرتے ہیں اور لوگوں کو مغالطہ دیتے ہیں اور بے سر و پا اتہام کرتے ہیں، ہمیشہ ممنون رہا ہوں اور رہوں گا۔ ان کا ناراض ہونا اور غصہ میں اگر حد سے تجاوز کر جانا کچھ تعجب کی بات نہیں ہے۔ ان کی مخالفت سے اگر میں آزردہ ہوں تو میری نادانی ہے۔ (صفحہ ۱۵۸)

اسی خط میں وہ اپنے دو بہت بڑے مخالفین کے بارے میں جو ساری عمر اُن کی مخالفت میں سرگرم رہے، لکھتے ہیں۔

میں اپنے قدیم دوست مولوی حاجی سید امداد العلی خاں بہادر سی۔ ایس۔ آئی اور آپ کے شہر کے مشہور عالم مولوی ابو سعید محمد حسین صاحب کی (جن کو دو ایک دفعہ اتفاقیہ دیکھا ہے) ایسی ہی قدر کرتا ہوں جس قدر وہ لائق ہیں۔ مجھ کو مطلق اس بات کا خیال نہیں ہے کہ یہ دونوں صاحب میری نسبت کیا لکھتے ہیں اور کیا کہتے ہیں (صفحہ ۱۵۹)

سرسید کانگریس کے شدید مخالفین میں سے تھے۔ اور اس زمانہ میں ہی انہوں نے بخوبی یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ کانگریس کا مقصد ہندو غلبہ اور مسلمانوں کی بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔ چنانچہ ۲۱ اگست ۱۸۸۹ء کو انہوں نے نینی تال سے مسلمانوں کی تمام انجمنوں کے نام ایک خط لکھا اور اس خط میں یہ واضح کیا کہ

اگر بفرض محال کانگریس مذکورہ کے مقاصد پورے ہو جائیں تو ہندوستان میں مسلمانوں کا حال یہودیوں سے بھی بدتر ہو جائے گا۔ پس میں ہر مسلمان کا فرض سمجھتا ہوں کہ کانگریس مذکورہ میں شریک نہ ہو اور اس سے اپنی بیزاری کا اظہار کرے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم انگلستان کے لوگوں اور پارلیمنٹ کے ممبروں کو جتلا دیں کہ حامیان کانگریس کا بیان غلط ہے اور مسلمان اس میں شریک نہیں۔ بجز ان معدودے چند کے جو سواد اعظم سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔ (صفحہ ۲۰۷-۲۰۸)

دشمنوں کی گالیوں اور کفر کے فتووں کے جواب میں سرسید نے ہمیشہ کس رواداری اور بے مثال صبر و ضبط بلکہ استقلال سے کام لیا اس کا ایک نمونہ ہمیں اس خط میں ملتا ہے جو انہوں نے ۱۰ اپریل ۱۸۹۴ء کو لاہور کے ایک اخبار "ملاں دو پیازہ" کے ایڈیٹر اللہ دین کو لکھا۔ وہ تحریر فرماتے ہیں۔

مہربان من! آپ نے بھی اپنے پرچے میں میری نسبت جودت طبع کا بہت کچھ اظہار کیا ہے میں آپ جانتے ہیں میں اول درجہ کا چکنا گھڑا ہوں اور گالیاں کھاتے کھاتے بے حیا بن گیا

ہوں۔ میں نے آج تک نہ تو کفر کے فتووں کی کوئی پرواہ کی ہے اور نہ اخبارات کی تحریروں کی۔ اور جب کہ آپ نے سُن لیا ہے کہ میں نے سفرِ پنجاب کے ارادہ کو بالکل توڑ دیا ہے تو امید ہے آپ بھی اس بارے میں زیادہ خامہ فرسائی نہ فرمائیں گے۔ (ص ۳۰۶)

سرسید کے خلاف بعض حلقے بڑے شد و مد سے یہ الزام عائد کیا کرتے ہیں کہ وہ انگریزوں کے بڑے حامی تھے اور اپنی قوم کو ایسا کرنے میں کوشاں تھے۔ سرسیدؒ کے خلاف یہ الزام بددیانتی پر مبنی ہے۔ ان کے زیرِ بحث خطوط میں جگہ بہ جگہ یہ تلقین موجود ہے کہ قوم کو اپنے پاؤں پہ کھڑا ہونے کے قابل بنایا جائے۔ اور انگریز حکمرانوں کا سہارا قبول کرنے سے حتی الامکان گریز کیا جائے۔ ہم ان کے صرف ایک خط کو قارئین کے سامنے لاتے ہیں۔ سرسیدؒ نے ۸، اگست سنہ ۱۸۸۸ء کو یہ خط مولوی سید ممتاز علی صاحب کو لکھا تھا اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ سرسیدؒ کی شخصیت ایسے الزامات سے کس قدر بالاتر تھی انہوں نے اپنے اس خط میں لکھا تھا۔

"ہم ہندوستانیوں کی تمام مجلسیں بے جان ہیں۔ یا تو ان میں کچھ ہوتا ہی نہیں یا کسی یورپین افسر کے ہاتھ فروخت ہوتی ہیں۔ اور اس کے مقاصد پائے کی تکمیل میں بھی آلۂ کار بن جاتی ہیں۔ میں اپنے دوستوں کو کئی دفعہ بطور وصیت کے کہہ چکا ہوں کہ میرے بعد مدرسۃ العلوم کا جو کچھ حال ہو سو ہو، مگر ایسا نہ کرنا کہ قوم کے ہاتھ سے نکل کر اور لوگوں کے قبضہ میں چلا جائے۔ بُری طرح یا بھلی طرح ہماری قوم ہی اس کی چلانے والی ہو۔ لوگ عام فائدہ کے کاموں میں حکام کے سامنے بھی اپنا سوخ چاہتے ہیں مگر حقیقت میں اپنی عزت کھو بیٹھتے ہیں۔"

(ص ۲۴۶ ۔ ۲۴۷)

اس مجموعے میں کل ڈیڑھ صد سے زیادہ خطوط شامل ہیں۔ مولوی مشتاق حسین صاحب نے ان خطوط کو یکجا کرنے میں بڑی محنت سے کام لیا ہے۔ اس سے قبل سرسیدؒ کے خطوط کے کئی ایک مجموعے گزشتہ پچاس ساٹھ برس میں شائع ہوتے رہے۔ لیکن یہ مجموعہ ان سب کو اپنے اوراق میں سمیٹے ہوئے ہے اور سرسیدؒ کی شخصیت اور ان کی سیرت و کردار کے بہت سے نمایاں گوشے قارئین کے سامنے لے آتا ہے۔ ان خطوط کے بین السطور سے اس دور کی قومی نفسیات کا عکس بھی اُبھر کر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ جب ہماری حیاتِ ملی کا سفینہ زوال اور شکست کے تھپیڑوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے مُرکتا میں آیا تھا اور سرسیدؒ کی قیادت اس کی ناخدائی کا فریضہ ادا کر رہی تھی۔ آزادی کی تابناک فضاؤں میں آج شاید ہم اُس عہد زوال و شکست کی اُلجھنوں اور ابتلاؤں کو پوری طرح نہ سمجھ سکیں۔ لیکن یہ خطوط بتاتے ہیں کہ جس مردِ مجاہد نے سب سے آگے بڑھ کر ان مشکلات و موانعات کا مقابلہ کیا اسے خود اپنی ہی قوم کے

مذہبی اجارہ داروں اور پیشواؤں کے ہاتھوں کس قدر زخم کھانے پڑے اور وہ کن مسکراہٹوں سے ان زخموں کو گوارا کرتا رہا۔

کتاب عام اخباری کاغذ پر شائع ہوئی ہے۔ اور اسے شایانِ شان دیدہ زیب بنانے کے بجائے سادگی کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کتابت و طباعت اوسط درجہ کی ہے اور قیمت چھ روپے پچاس پیسے۔

۲۔ تعبیر کی غلطی

یہ کتاب غمازی کرتی ہے اس ذہنی کشمکش اور قلبی پریشانی کی جس میں جماعت اسلامی کی ہندوستان کی شاخ آج کل مبتلا نظر آتی ہے۔ کتاب کے مصنف، محترم وحید الدین خان سنہ ۱۹۴۹ء سے اس جماعت سے وابستہ چلے آ رہے تھے۔ وہ اس کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے اور اس مجلس نے انہیں جماعت کے ترجمان (رسالہ زندگی) کی ادارت کے لئے بھی نامزد کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ قریب دس سال تک وہ جماعت کے ساتھ پوری دلچسپی کے ساتھ وابستہ رہے۔ پھر قرآن کریم کے بغور مطالعہ کے بعد ان کے خیالات میں تبدیلی پیدا ہونی شروع ہوئی۔ اس سے ان کے دل میں خلجان اور ذہن میں خلش پیدا ہوئی جسے رفع کرنے کے لئے انہوں نے قریب چار سال تک جماعت کے چوٹی کے افراد (مودودی صاحب سمیت) سے خط و کتابت کی لیکن ان کے جوابات سے ان کی تسلی نہ ہوئی تو انہوں نے جماعت سے استعفیٰ دے دیا۔ اب اس خط و کتابت، اور اپنے خیالات کو انہوں نے زیرِ تبصرہ کتاب کی شکل میں شائع کر دیا ہے۔ جماعت سے ان کا اختلاف فروعی قسم کا نہیں، اصولی ہے۔ یعنی وہ دین کی اس تعبیر ہی کو غلط سمجھتے ہیں جسے مودودی صاحب پیش کرتے ہیں۔ قارئین کو یاد ہو گا کہ جب پاکستان کی جماعت اسلامی کے بعض ممتاز اراکین (مثل مولانا امین احسن اصلاحی اور حکیم عبدالرحیم اشرف وغیرہ) جماعت سے الگ ہو گئے تھے۔ تو انہوں نے اپنی علیحدگی کی وجہ یہ بتائی تھی کہ جماعت کی تنظیم کے زمانے میں مودودی صاحب دین کے جو اصول پیش کرتے تھے، جب اقتدار حاصل کرنے کا مرحلہ سامنے آیا تو انہوں نے ان اصولوں کو خیرباد کہہ دیا۔ یعنی ان حضرات نے مودودی صاحب کی اس دورنگی سیرت سے تنگ آ کر جماعت کو چھوڑا۔ اور وحید الدین صاحب نے اس جماعت سے اس لئے قطع تعلق کیا کہ وہ سرے سے دین کی اس تعبیر ہی کو غلط سمجھتے ہیں جو مودودی صاحب کی طرف سے پیش کی جاتی ہے۔ اور جس پر جماعت اسلامی کی ساری عمارت استوار ہے۔

مودودی صاحب کی تعبیر یہ ہے کہ دین نام ہی اقتدار حاصل کرنے اور حکومت کی کرسیاں چھیننے

کا ہے۔ مودودی صاحب خود تو ان کرسیوں کے پیچھے کشاں کشاں یہاں چلے آئے اور جماعت کی ہندوستان شاخ سے کہہ آئے کہ تم میری تعبیر کو وہاں بیٹھے عملی جامہ پہناؤ۔ وہاں کی جماعت نے جب اپنی اس پوزیشن پر غور کیا تو وہ عجیب تذبذب میں پھنس گئی اس کے لئے ان بے چاروں کو کیا کرنا پڑا اسے وحید الدین خان صاحب کے الفاظ میں سنئے۔ وہ لکھتے ہیں۔

اسلام کے اس تصور کے مطابق دنیا میں اہل ایمان کا جو "نصب العین" قرار پاتا ہے اس کو جماعت اسلامی کی ابتدائی تاسیس کے وقت مندرجہ ذیل فقرے میں بیان کیا گیا تھا۔

"جماعت اسلامی کا نصب العین اور اس کی تمام سعی وجہد کا مقصود دنیا میں حکومت الٰہیہ کا قیام اور آخرت میں رضائے الٰہی کا حصول ہے۔"

دستور میں نصب العین کے اس فقرے کی تشریح کرتے ہوئے بتایا گیا تھا کہ

"اس سے مراد اللہ کی شرعی حکومت کا قیام ہے، جس کا تعلق انسان کی زندگی کے اس حصے سے ہے جس میں اللہ نے انسان کو اختیار عطا کیا ہے"

(تعبیر کی غلطی۔ جماعت اسلامی کا جائزہ صـ ۲۹۸)

اس کے بعد اس نصب العین میں یوں تبدیلی کی گئی۔

ملک کی تقسیم کے بعد جب ہندوستان کی علیحدہ جماعت قائم ہوئی تو یہاں کے رہنماؤں نے نصب العین کے فقرے میں کچھ تبدیلی کر دی اور اس کو مندرجہ ذیل الفاظ میں ظاہر کیا۔

"جماعت اسلامی کا نصب العین اور اس کی تمام سعی وجہد کا مقصود دنیا میں اقامت دین (اللہ تعالیٰ کے دین کو قائم کرنا) اور آخرت میں رضائے الٰہی کا حصول ہے۔" (ایضاً صـ ۲۹۹)

اس کے نیچے یہ فٹ نوٹ دیا گیا۔

"دستور جماعت میں اس سے پہلے اقامت دین کے بجائے حکومت الٰہیہ کا لفظ تھا جو دراصل اسی مفہوم میں استعمال کیا گیا تھا جو اقامت دین کا ہے۔ لیکن چونکہ حکومت الٰہیہ کے لفظ کے سمجھنے میں غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور کرائی جاتی ہیں اس لئے ضرورت سمجھی گئی کہ اپنے نصب العین کے اظہار کے لئے ایسا لفظ اختیار کیا جائے جو قرآن کا ایک اصطلاحی لفظ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے تمام مفہوموں پر حاوی بھی ہو۔ اور کسی غلط فہمی کا باعث بھی نہ ہو۔"

(ایضاً صـ ۲۹۹)

مصنف کتاب نے جماعت اسلامی کے اس رجحان کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"جماعت اسلامی کی تاریخ میں یہ نیا رجحان پیدا ہونے کی پہلی اور خاص وجہ یہ ہے کہ جماعت کا جو فکر ہے اس کے مطابق اس کا ذہن قدرتی طور پر "سیاسی" قسم کے کام تلاش کرتا ہے۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان کے مخصوص حالات کی بنیاد پر وہاں کی جماعت کو ایسے کام مل گئے اور وہ اس کے سہارے کھڑی ہوگئی مگر ہندوستان کے حالات مختلف تھے اس لئے یہاں ایسا کوئی کام نکل نہ سکا۔ یہ چیز ہندوستان میں تحریک کے افراد کو جمود اور سرد مہری میں مبتلا کر رہی تھی۔"

(ایضاً ص۲۹۶)

آپ کو معلوم ہے کہ جماعت اسلامی کی روش یہ ہے کہ وہ آج ایک بات کہتی ہے اور اسے عین مطابق اسلام بتاتی ہے۔ کل ہی وہ اس بات کی بالکل ضد دوسری بات کہتی ہے اور اسے بھی عین مطابق اسلام قرار دیتی ہے۔ مصنف نے اس کی ایک بڑی دلچسپ مثال اپنے ہاں کی جماعت اسلامی کی روش سے دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"مثال کے طور پر ہندوستان کے خلاف چینی جارحیت کے مسئلہ پر جماعت اسلامی ہند نے ۱۹۶۲ء کے آخر میں ایک پوسٹر شائع کیا جس کا عنوان تھا ——— "آزادی کی حفاظت کیجئے"۔ اس پوسٹر میں "مل جل کر اس چیلنج کا منہ توڑ جواب" دینے کے جو وجوہ بتائے گئے تھے ان میں ایک وجہ یہ بھی تھی کہ۔

"(چین) اللہ کے بندوں کو اپنا بندہ اور غلام بنانا چاہتا ہے"

ظاہر ہے کہ اس فقرے کا چینی جارحیت کے خلاف مظاہرہ سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ چین کے مجرم ہونے کی دلیل اگر یہی ہے تو جماعت اسلامی کے مبینہ نظریہ کے مطابق ٹھیک یہی جرم وہ حکومت بھی کر رہی ہے جس کی حمایت میں یہ مظاہرہ کیا گیا۔ پھر ایک مجرم کا طرفدار بن کر دوسرے مجرم سے لڑنا کیا معنی ——— دراصل یہ فقرہ یہاں صرف اس تسکین کے لئے رکھا گیا ہے کہ یہ جو کچھ ہم کرنے جا رہے ہیں یہ عین ہمارے مقصد کا تقاضا ہے، یہ اس سے الگ کوئی چیز نہیں ہے"

(ایضاً ص۳۲۲)

مصنف نے اس کشمکش سے نکلنے کی صورت یہ اختیار کی کہ سرے سے دین کی اس تعبیر ہی سے اظہار برأت کر دیا جسے وہ پندرہ (یا کم از کم دس) سال تک عین مطابق دین قرار دیتے چلے آ رہے تھے۔ زیر تبصرہ کتاب، اس تعبیر کو غلط ثابت کرنے کی کوشش ہے۔ اس کے برعکس ان کے نزدیک مومن کا مقصد زندگی اللہ سے تعلق پیدا کرنا اور اس سے جڑ کر رہنا ہے۔ یعنی وہی بات جو افراط و تفریط کا جھولا جھولنے والوں کے ہاں ہوتی ہے۔ جماعت اسلامی کی طرف جاتے ہی شدید قسم کے جذباتی لوگ ہیں۔ جن کے لئے اعتدال پر رہنا مشکل ہوتا ہے لیکن

مصنف کتاب کی دوسری مشکل یہ ہے کہ وہ جس مسلک کو دس پندرہ سال تک مسلک حقہ کہتے چلے آئے ہیں اس کی یکسر تردید بھی نہیں کر سکتے۔ اس لئے وہ ساتھ کے ساتھ یہ بھی کہتے چلے جاتے ہیں کہ مسلک وہ بھی ٹھیک ہے لیکن اس کی حیثیت ثانوی ہے۔ اس برزخی کشمکش نے انہیں نہ ادھر کا رہنے دیا ہے نہ ادھر کا۔

کتاب میں جماعت اسلامی کے ممتاز ارکان کے ساتھ جو خط و کتابت شامل ہے وہ دلچسپ ہے۔

کتاب اسلامک پبلشنگ ہاؤس۔ اعظم گڑھ (انڈیا) سے شائع ہوئی ہے۔ اور غیر مجلد (پیپر کور) کی قیمت ۶/۰ روپے ہے۔

قرآنی فکر کے السابق الاول رفیق کو صدمہ

وابستگانِ فکرِ قرآنی میں سے محترم مولانا عبدالرب صاحب کی ذات گرامی سے کون واقف نہیں۔ وہ جنہوں نے سب سے پہلے اس فکر پر لبیک کہا اور اس وقت تک پیرانہ سالی کے باوجود، جوانوں کی سی گرمجوشی کے ساتھ اسے سمجھنے اور سمجھانے میں ہمہ تن سعی و عمل ہیں۔ پریس میں جا رہا تھا کہ یہ جانکاہ خبر ملی کہ ان کی رفیقۂ حیات کا انتقال ہو گیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عنایت فرمائے۔

ہمارے ہاں تو صرف بیوی کو رفیقۂ حیات کہا جاتا ہے لیکن مولانا موصوف نے اپنے عمل سے یہ بتایا کہ قرآن کی رو سے، خاوند بھی کس طرح بیوی کا رفیقِ حیات ہوتا ہے مرحومہ تقسیم ہند سے بھی بہت پہلے سے صاحب فراش تھیں۔ بالکل صاحب فراش۔ اس طول طویل بنایت صبر آزما اور جانگسل مرحلہ میں مولانا نے جس ہمت، استقلال اور خندہ پیشانی سے اپنی رفاقت کا حق ادا کیا ہے اس کی مثال صرف وہیں مل سکیگی جہاں قرآنی فکر نے عملی پیکر اختیار کر لیا ہو۔ دوسری طرف مرحومہ کی رفاقت کا بھی یہ عالم تھا کہ چلنے پھرنے سے تو بے شک معذور تھیں لیکن ذہنی اور قلبی طور پر مولانا کی ہر کاوش میں برابر کی شریک تھیں۔ اس طرح اس گھر میں قرآنی مفہوم میں صحیح "زوج" کا نقشہ نظر آتا تھا۔ افسوس کہ اجل کے ہاتھوں یہ رشتہ ٹوٹ گیا۔ مولانا کے لئے یہ صدمہ کس قدر جانکاہ ہے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

صدمہ کے اثرات کا بانٹنا تو مشکل ہوتا ہے لیکن ہم مولانائے موصوف کو یقین دلاتے ہیں کہ اس وقت ہزاروں قلوب بہ صدق و خلوص ان کے اس غم میں شریک حال ہیں۔ ہمیں امید واثق ہے کہ مولانا اس جانگداز مرحلہ میں بھی قرآن کے الصابرین الذین اذا اصابتہم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون کے پیمانے پر کیسر پورے اتر کر ہم سب کے لئے مشعلِ راہ اور وجہ تقویتِ ایمان ثابت ہوں گے۔ اللہ ایسا ہی کرے اور انہیں اس کی توفیق وافر عطا فرمائے۔

مولانا کے علاوہ اس غم میں ہم ان کے بچوں اور بچوں کے بھی برابر کے شریک ہیں حقیقت یہ ہے کہ اس قرآنی گھرانے کا غم، سب کا مشترکہ غم ہے۔

(ادارہ طلوع اسلام)

حقائق و عبر

۱- جب اپنے پر پڑی تو.....

جماعت اسلامی کے ترجمان شہاب کی یکم دسمبر ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

۵ نومبر ۱۹۶۳ء کا "حریت" یا "جنگ" اٹھا کر دیکھئے۔ صفحۂ اول پر آپ کو وہ خبر ملے گی جسے نقل کرتے ہوئے میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں، دل لرز رہا ہے اور آنکھیں نمناک ہیں۔ لیجئے آپ بھی وہ خبر پڑھ لیجئے۔

"مولانا مودودی کے خلاف کفر کا فتوے"

مولانا غلام غوث ہزاروی اور مفتی محمود نے کہا ہے کہ مولانا مودودی اور ان کے جماعت کے افراد دائرۂ اسلام سے خارج ہیں اور ان کے پیچھے نماز پڑھنا اور ان سے راہ و رسم رکھنا جائز نہیں۔ تاآنکہ وہ اپنے غلط عقائد سے توبہ کر کے طاہر نہ ہو جائیں۔ (روزنامہ حریت کراچی)

یہاں سوال کفر کے فتوے کا نہیں۔ وہ تو یہ لوگ اپنے ہی زعماء کے خلاف بھی دے چکے ہیں اور ان کی ہی قسم کے مولوی ہر دور میں علمائے حق کے خلاف فتوے دیتے رہے ہیں۔" (شہاب یکم دسمبر ۱۹۶۳ء صفحہ ۱۵)

اس کے بعد کفر سازی کی اس لغویت پر ماتم کیا گیا ہے۔

اسی پرچہ کی ۱۵ دسمبر کی اشاعت میں مولانا شبلی مرحوم کی ایک نظم، حسب ذیل نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

"پاکستان میں ان دنوں "کافر گری" عام ہے۔ مختلف فرقوں کے علماء ایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگا رہے ہیں۔ وہ لوگ بھی جن کی عمریں خدمتِ اسلام میں بسر ہوئیں، یہ سرٹیفکیٹ لے چکے ہیں۔ مسلمان تو سال میں بھی مشکل سے کسی کو بنا پاتے ہیں لیکن علم کی فیکٹریوں میں کافر ہر روز

لاتعداد ڈھالے جاتے ہیں۔ جب ان اکابر کی فہرست پر نظر جاتی ہے جنہیں کافر بنایا جا چکا ہے تو خیال پڑتا ہے کہ اس دور میں شاید اس آدمی کا ایمان ہی مسلّم نہ ہو گا جس پر کفر کا فتویٰ نہیں لگا۔ مولانا شبلی مرحوم نے اپنے زمانے میں اس کافر سازی پر احتجاج کیا تھا۔ ان کی نظم ذیل میں ہدیۂ قارئین ہے۔ کاش کہ مکفّر حضرات اس آئینے میں اپنے خدوخال ملاحظہ فرمائیں۔

(شہاب ۱۵ دسمبر ۱۹۶۳ء ص۲)

شغلِ تکفیر کی فتنہ گری کے خلاف واویلا مچانے والے، یہ وہ حضرات ہیں کہ جب دو سال اُدھر اسی قسم کا فتویٰ پرویز صاحب کے خلاف لگایا گیا تھا تو یہ اُسے ہر جگہ اچھالتے پھرتے تھے۔ اب جب اپنی باری آئی ہے تو انہیں یہی کفرسازی انتہائی لغویت نظر آ رہی ہے۔ ہم ان حضرات سے گزارش کریں گے کہ یہ لغویت بہرحال لغویت ہے۔ خواہ اس کا ارتکاب اپنوں کے خلاف ہو یا دوسروں کے۔ جب تک ہم اپنی نگاہ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا نہیں کریں گے ہمارے کسی احتجاج کا کچھ اثر نہیں ہو گا۔

۲۔ تین طلاق

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو ایک وقت میں تین طلاق دے دے (یعنی تین دفعہ کہہ دے طلاق۔ طلاق۔ طلاق) تو حنفی حضرات کے نزدیک یہ طلاق بائن ہو جاتی ہے جس کے بعد یہ میاں بیوی آپس میں نکاح نہیں کر سکتے۔ لیکن اہلِ حدیث حضرات ایسی طلاق کو صرف ایک طلاق شمار کرتے ہیں۔ اس لئے اسے رجعی قرار دیتے ہیں۔ ان حضرات کا دعویٰ ہے کہ رسول اللہ کے زمانے میں ایسا ہی ہوتا تھا۔ اور مذکورہ صدر تبدیلی حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں کی تھی۔ یہ مسئلہ احناف اور اہلِ حدیث حضرات میں شروع سے متنازعہ فیہ چلا آ رہا ہے۔ اس سلسلے میں (اہلِ حدیث حضرات کے ترجمان) "الاعتصام" میں ایک مضمون مسلسل شائع ہو رہا ہے جس میں کہا گیا ہے:۔

"اہل حدیث کا دعویٰ ہے کہ یہ حدیث صاف دلالت کرتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں لوگ تین طلاقیں اگر ایک وقت کی دیتے تھے تو ایک ہی شمار کی جاتی تھی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ صحابہ کرامؓ اس قسم کے عظیم احکام اپنے پاس سے ایجاد نہ کر لیا کرتے تھے۔ بلکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد سے کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں بھی یہ حکم بدستور رہا۔ یہاں تک کہ حضرت عمرؓ کی خلافت کے دو سال تک بھی یہی حکم تھا۔ پھر جب لوگوں نے ایک ہی دفعہ کی متعدد طلاقیں دینے کی عادت کر لی جو اگرچہ ایک ہی شمار ہوتی تھی

مگر شریعت میں متعدد طلاقیں ایک ہی دفعہ کی دینی ناپسند کی گئی تھیں اس لئے حضرت عمرؓ نے لوگوں کو روکنے کے لئے یہ حکم جاری کر دیا کہ جو کوئی تین طلاقیں دے گا، تین ہی شمار ہوں گی۔ جس سے یہ مقصد تھا کہ لوگ یہ دھمکی سن کر ایسی ناشائستہ حرکت سے باز آجائیں۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کیا تمام دنیا میں بھی سوائے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کسی کو منصب شریعت کا حق نہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کا یہ حکم کس قسم کا ہے۔ یہ ایک انتظامی نوعیت کا حکم ہے جو حاکم وقت کسی مصلحت سے یا کسی بدنظمی کو بند کرنے کے لئے جاری کردے یا سزا بڑھا دے۔"

(الاعتصام۔ بابت ۲۹ نومبر ۱۹۶۳ء صفحہ)

اس کے بعد لکھا ہے۔

اس حدیث سے بھی ثابت ہوا کہ حضرت عمرؓ کا تینوں شمار کرنا مصلحت وقتی تھا۔ شرعی حکم کا نفاذ نہیں تھا۔

اس سے ایک اہم اصولی سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ کیا حاکم وقت اپنے زمانے کے مصالح کے پیش نظر ایسے احکام نافذ کر سکتا ہے جو رسول اللہ کے متعین فرمودہ احکام سے مختلف ہوں؟ الاعتصام نے جو کچھ لکھا ہے اس سے واضح ہے کہ حاکم وقت ایسا کر سکتا ہے۔ یہی وہ بات ہے جسے ہم کہتے ہیں۔ یعنی یہ کہ قرآن کریم کے قوانین اور اصول غیر متبدل ہیں۔ اور جو احکام ان اصولوں کی روشنی میں متعین کئے گئے تھے ان میں خلافت علیٰ منہاج نبوت (یعنی اسلامی حکومت) اپنے زمانے کے تقاضوں کے پیش نظر تبدیلی کر سکتی ہے۔

اور ہمارا یہی وہ جرم ہے جس کی بنا پر ہمیں منکرِ حدیث کہا جاتا ہے۔ یعنی وہی بات الاعتصام کہے تو وہ اہلِ حدیث کا ترجمان۔ اور جب ہم وہی بات کہیں تو منکرِ حدیث!

ہم جو چپ بیٹھیں، منکری کہلائیں　　شیخ چپ بیٹھے تو کل ٹھہرے

۳۔ اختلافات کی نوعیت

جب ہم کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے مسالک کو مسترد [illegible] کیا جائے تو ان [illegible] قسم [illegible] تو ایسی مرتب ہی نہیں ہو سکتے جنہیں تمام مسلمان اسلامی تسلیم کر لیں کیونکہ ان فرقوں میں باہمی اختلافات بڑے شدید ہیں تو اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ نہیں۔ یہ اختلافات محض فروعی ہیں انہیں ایسی اہمیت حاصل نہیں۔

اہلِ حدیث کے ترجمان (الاعتصام) میں، احناف کے ساتھ ایک بحث چل رہی ہے۔ اس سلسلہ میں اس کی ۱۲ دسمبر کی اشاعت میں شائع شدہ ایک مضمون میں لکھا ہے۔

"یہ تو ایک اصل کی ایک جزی کو نہایت اختصار سے نقل کیا گیا ہے۔ اگر اس پر اور دیگر سینکڑوں اصول جو نصوص اور ائمہ اہلِ حدیث کی تردید کے لئے وضع کئے گئے ہیں، بحث و تمحیص کیلئے قلم کو اجازت دی جائے تو ایک مبسوط کتاب مرتب ہو جائے۔ وہ کون سا بزرگ ہے جس نے حنفیت کے کسی مسئلہ سے اختلاف کیا ہو۔ اور پھر اس کو خارج از اسلام کرنے کے لئے اصول نہ وضع کئے گئے ہوں۔ اصول سے ہٹ کر دیکھیے بھی احناف کرام کی ائمہ اہلِ حدیث کے متعلق گفتگو اس طرح کی ہوتی ہے۔ جس کا نمونہ آپ فاضلِ دیوبند کی کلام میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ ہم اگر ان کے بزرگوں کے وہ اقوال اور ملفوظات جو اہلِ حدیث کی تحقیر و تنقیص میں ان کی کتابوں میں موجود ہیں، پیش ہی کریں تو غالباً اس کو بھی ہماری کم ظرفی اور پنچھورے پن پر محمول کریں گے۔" (الاعتصام ۱۲ دسمبر سنہ ۶۳ء صـ۲)

آپ ان الفاظ پر ایک مرتبہ پھر غور فرمایئے کہ

وہ کون سا بزرگ ہے جس نے حنفیت کے کسی مسئلہ سے اختلاف کیا ہو اور پھر اسے خارج از اسلام کرنے کے لئے اصول نہ وضع کئے گئے ہوں۔

اس کے بعد آپ سوچئے کہ کیا ان فرقوں کے اختلافات محض فروعی ہیں جنہیں چنداں اہمیت حاصل نہیں یا ایسے بنیادی کہ ان کی بنا پر یہ ایک دوسرے کو خارج از اسلام قرار دیا جاتا ہے؟ اور ان دونوں فرقوں کا دعویٰ یہ ہے (بلکہ ہر فرقے کا دعویٰ) کہ ہمارے احکام "کتاب و سنّت" پر مبنی ہیں۔ جہاں تک کتاب اللہ کا تعلق ہے اس کا دعویٰ یہ ہے کہ میرے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ مجھ میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اب آپ سوچئے کہ جس کتاب کا دعویٰ یہ ہو (اور اس دعوے کی صداقت پر ہمارا ایمان ہو) تو کیا یہ کسی طرح بھی ممکن ہے کہ جن احکام کی بنیاد ایسی کتاب پر ہو ان میں اس قدر اختلافات ہوں؟ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے کہ ایسا ممکن ہے تو اس کتاب کا یہ دعویٰ (معاذ اللہ) غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ تمام اختلافات، کتاب اللہ سے ہٹ کر اور چیزوں کو بنیاد قرار دے لینے سے پیدا ہوتے ہیں۔

اور پھر یہ بھی سوچئے کہ جب تک آپ ان چیزوں کو بنیاد تسلیم کرتے رہیں گے، ان اختلافات کے مٹنے کی کوئی صورت پیدا ہو سکے گی؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکے گا۔ ہماری ہزار برس کی تاریخ خود اس پر شاہد

ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ان اختلافات کے مٹنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ہم کتاب اللہ کو بنیاد تسلیم کریں۔ اسی سے ایسے احکام و قوانین مرتب ہو سکیں گے جن کا اطلاق اسلامی قوانین کی حیثیت سے، تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے گا۔

پاکستان میں قانون سازی کا یہی وہ اصول ہے جس کی طرف ہم دعوت دیتے چلے آرہے ہیں لیکن فرقوں میں جکڑی ہوئی مذہبی پیشوائیت کی طرف سے جس کی اس قدر مخالفت ہو رہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا اس کے علاوہ کوئی اور صورت بھی ہے جس سے تمام مسلمانوں کے لئے مشترکہ اسلامی قوانین مرتب کئے جا سکیں؟ ہمارے قدامت پرست مذہبی طبقہ کی طرف سے اس کا کوئی جواب نہیں دیا جاتا ــــ نہ ہی دیا جا سکتا ہے۔

یاد رکھیے۔ جب تک یہ شکل اختیار نہیں کی جائے گی، ہمارے فرقے نہیں مٹ سکیں گے ــــ اور فرقے نہیں مٹیں گے تو ہم خود مٹ جائیں گے!

۴۔ فریب دہی کی انتہا

طلوعِ اسلام کے سابقہ شمارہ میں "جماعت اسلامی (خود اپنے آئینہ میں)" کے عنوان سے جو مفصل مقالہ شائع ہوا ہے اس نے اس جماعت کے حلقہ میں بُری طرح کھلبلی پیدا کر دی ہے جو کچھ اس مقالہ میں لکھا گیا ہے اس کا جواب تو ان حضرات کے پاس ہے نہیں۔ لہٰذا ان کے لئے اس کے سوا چارہ کیا ہے کہ یہ (کم از کم) اپنے حلقہ کو مزید فریب دینے کی کوشش کریں۔ اس فریب دہی کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔ ۱۲۔ دسمبر کے ایشیا کے پہلے صفحہ پر نہایت جلی سُرخیوں کے ساتھ ایک مضمون شائع ہوا ہے، جس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ طلوعِ اسلام نے جو کچھ لکھا ہے مودودی صاحب نے وہ کبھی کچھ نہیں کہا تھا۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

> لگے حوالہ پر یہ عنوان جمایا گیا ہے "قائدِ اعظمؒ کی عظمت پر کردار پر حملہ" اور اس ضمن میں حوالہ دیا گیا ہے "افسوس کہ لیگ کے قائدِ اعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو۔ اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو۔"
>
> اب ذرا آپ سیاسی کشمکش حصہ سوم کا صفحہ ۳۷ نکال کر دیکھئے۔ آپ یہ دیکھ کر ششدر رہ جائیں گے کہ یہاں متعلقہ فقروں کے ساتھ "قائدِ اعظمؒ" کے الفاظ موجود ہی نہیں۔

یہ پڑھنے کے بعد یقیناً ہر شخص اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ طلوع اسلام والے بڑے بددیانت ہیں کہ اپنی طرف سے الفاظ بڑھا کر انہیں مودودی صاحب کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ کوئی زیادہ احتیاط برتے گا تو سیاسی کشمکش حصہ سوم کا ص۵۲ نکال کر دیکھ لے گا۔ اور جب اس میں نہ یہ عبارت ملے گی نہ الفاظ تو اس کے نزدیک طلوع اسلام کی بددیانتی میں کوئی شبہ ہی نہیں رہے گا۔

لیکن آپ ذرا طلوع اسلام میں شائع شدہ مضمون کا متعلقہ حصہ دیکھئے اس میں اس اقتباس کے ساتھ "سیاسی کشمکش حصہ سوم ص۵۲" کا ذکر تک نہیں۔ اس میں حوالہ دیا گیا ہے "ترجمان القرآن ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ ۲۳" اور وہاں یہ عبارت بھی موجود ہے اور "قائداعظم" کے الفاظ بھی۔ پھر آپ سیاسی کشمکش حصہ سوم اٹھائیے۔ اس میں ص۵۲ نہیں بلکہ ص۳۷ دیکھئے۔ اس میں آپ کو یہی عبارت اور یہی الفاظ ملیں گے۔ ہم مدیر ایشیا سے عرض کریں گے کہ اگر انہیں اس میں کوئی شبہ ہو تو وہ کسی شریف آدمی کو ہمارے ہاں بھیجیں ہم انہیں دونوں جگہ یہ الفاظ دکھا دیں گے۔

آپ نے غور فرمایا کہ صالحین کی یہ جماعت لوگوں کو فریب دینے کے لئے کیا کیا ہتھکنڈے برتتی ہے! آپ سوچئے کہ جن لوگوں کی کذب بافی اور فریب دہی کی حالت یہاں تک پہنچ چکی ہو، ان کے کسی قول و فعل کا اعتبار کیا جا سکتا ہے؟

مُفت

دوا — برائے — دمہ۔ درد گردہ و پتھری

ملنے کا پتہ

حاجی محمد دین شیخ آئل فیکٹری متصل گنیش کھوپرا ملز

لارنس روڈ — کراچی

اپنے پتہ کا لفافہ بھیج کر دوا مفت منگالیں۔

عائلی قوانین میں ترامیم

مقامِ شکر و اطمینان ہے کہ پاکستان کی مرکزی اسمبلی، اس شور و غوغا سے متاثر نہیں ہوئی جو عائلی قوانین کے خلاف قدامت پرست طبقہ کی طرف سے برپا کیا جا رہا تھا۔ اس نے ان قوانین کو بحال رکھنے کا فیصلہ کر دیا ہے۔ جیسا کہ ہم اس سے پہلے کئی بار لکھ چکے ہیں یہ قوانین سابقہ قوانین کے مقابلہ میں قرآن کریم کے احکام سے زیادہ قریب ہیں لیکن بالکلیہ ان کے مطابق نہیں۔ اب جو مرکزی اسمبلی پہلے مرحلہ سے فارغ ہو گئی ہے تو ہم ارباب حکومت کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ وہ ان قوانین کے ان نقائص اور اسقام کو دور کرنے کی طرف قدم اٹھائیں جو ان میں قرآنی نقطۂ نگاہ سے موجود ہیں تاکہ یہ قوانین احکامِ خداوندی کے عین مطابق ہو جائیں۔ ذیل میں ہم ان نقائص کی نشان دہی کرتے ہیں تاکہ ان کی روشنی میں موجودہ قوانین میں ترمیم کر لی جائے۔ واضح رہے کہ چونکہ ہم اس سلسلے میں اس سے پہلے بہت کچھ لکھ چکے ہیں اس لئے اس وقت مجوزہ ترمیمات کے متعلق دلائل و وجوہات کے دہرانے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ صرف ترمیمات پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ تعددِ ازدواج

ایک سے زیادہ بیویوں کے متعلق موجودہ قوانین میں حسبِ ذیل شق رکھی گئی ہے۔

" جو شخص اپنی پہلی بیوی یا بیویوں کی موجودگی میں اور شادی کرنا چاہے گا اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اس امر کی درخواست کونسل کے چیئرمین کو دے جس میں دوسری شادی کے لئے وجوہات درج ہوں نیز یہ بھی مذکور ہو کہ اس کے لئے اس نے اپنی موجودہ بیوی یا بیویوں کی رضامندی حاصل کر لی ہے۔ چیئرمین ایک ثالثی کونسل مقرر کرے گا۔ جس میں اس مرد اور اس کی بیوی یا بیویوں کے نمائندگان شامل ہوں گے یہ ثالثی کونسل فیصلہ کرے گی کہ اس شخص کو دوسری شادی کی

اجازت دی جا سکتی ہے یا نہیں۔ اس کونسل کی اجازت کے بغیر شادی کرنا جرم قرار پائے گا جس کی سزا ایک سال تک قید یا پانچ ہزار روپے تک جرمانہ یا دونوں سزائیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) قرآن کریم کی رُو سے، ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت صرف اسی صورت میں دی جا سکتی ہے کہ

(۱) معاشرہ میں یتیم بچوں، یا غیر شادی شدہ (نا کتخدا یا بیوہ) عورتوں کے مسئلہ کا حل درپیش ہو - یعنی ملک میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں جن میں بیوہ عورتوں یا ایسی یتیم لڑکیوں کی کثرت ہو جائے اور "ایک بیوی کے قانون" کے مطابق انہیں خاوند نہ مل سکیں تو ان عورتوں کو جزوِ خاندان بنانے کے لئے قرآن نے اس قانون میں استثناء کی اجازت دی ہے۔ لہذا دوسری شادی صرف ان حالات میں دی جا سکتی ہے اور اسے انہی عورتوں تک محدود رکھا جا سکتا ہے۔

(۲) مرد ان بیویوں میں عدل کر سکتا ہو۔ عدل کے لئے ضروری ہے کہ اس کی معاشی حالت اس کی متحمل ہو سکے۔ اور پہلی بیوی بطیبِ خاطر اس کی اجازت دے۔

موجودہ شق میں ان امور کی صراحت ضروری ہے۔

(ب) ان قوانین کے لئے الگ عدالتیں مقرر کی جائیں اور کونسل کی بجائے، تمام معاملات ان عدالتوں کے سامنے پیش ہوں۔ یہ ترمیم نہایت ضروری ہے۔

۲- طلاق

طلاق کے سلسلے میں ان قوانین میں یہ کہا گیا ہے۔

۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہو تو طلاق کا اعلان کرنے کے بعد اس یونین کونسل کے چیئرمین کو تحریری طور پر نوٹس دے گا جس کے علاقہ میں اس کی بیوی رہتی ہے۔ اس نوٹس کی نقل وہ اپنی بیوی کو بھی مہیا کرے گا۔ اگر وہ ایسا کرنے سے قاصر رہے تو وہ سزا کا مستوجب ہوگا۔ (ایک سال تک قید یا پانچ ہزار روپیہ تک جرمانہ یا دونوں سزائیں) چیئرمین نوٹس موصول ہونے پر ۳۰ دن کے اندر اندر صلح صفائی کی غرض سے ایک ثالثی کونسل مقرر کرے گا جس میں فریقین کے نمائندے شامل ہوں گے۔ اگر اس کونسل کی تمام کوششوں کے باوجود فریقین میں صلح صفائی نہ ہو سکے تو مقررہ ضابطے کے مطابق ۹۰ دن کی عدت کے بعد طلاق موثر ہوگی۔

اس شق میں بہت سے اسقام ہیں۔

(۱) اس میں مرد کو حق دیا گیا ہے کہ وہ جب جی چاہے طلاق کا اعلان کر دے۔ یہ چیز قرآن کریم کے منشاء کے خلاف ہے۔ اس شق کو یوں بدل دینا چاہیئے۔

جو شخص اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کرے اسے چاہیئے کہ اپنے اس ارادہ کی اطلاع عدالت متعلقہ کو دے۔

(ب) اس میں طلاق کے اعلان کا حق صرف مرد کو دیا گیا ہے۔ عورت کو نہیں۔ عورت کے متعلق کہا گیا ہے کہ

اگر طلاق کا حق باضابطہ طور پر بیوی کو دیا گیا ہو تو وہ طلاق کا اعلان کر کے ثالثی کونسل کی طرف رجوع کر سکتی ہے)۔

"بیوی کو طلاق کا باضابطہ حق دینے" کا کچھ مطلب نہیں۔ قرآن کی رو سے اس باب میں مرد اور عورت کے حقوق میں کوئی فرق نہیں۔ اس لئے جو قاعدہ مرد کے لئے مقرر کیا جائے وہی عورت کے لئے مقرر کیا جانا چاہیئے۔ لہٰذا اس پوری شق کو یوں تبدیل کر دینا چاہیئے:

میاں یا بیوی میں سے جو کوئی معاہدہ نکاح فسخ کرنے کا ارادہ کرے اسے چاہیئے کہ اپنے اس ارادہ کی اطلاع عدالت متعلقہ کو دے۔

(ج) ان قوانین میں کہا گیا ہے کہ اگر مصالحت نہ ہو سکے تو نوٹس کی تاریخ کے (۹۰) دن بعد طلاق مؤثر سمجھی جائے گی۔ یہ بھی غلط ہے۔ قرآن کی رو سے طلاق اس دن سے مؤثر سمجھی جائے گی جس دن عدالت تنسیخِ نکاح کا فیصلہ دے اور عدت بھی اسی دن سے شروع ہوگی۔

(د) قرآن کی رو سے مطلقہ عورت کی عدت حسب ذیل ہے۔

(i) تین حیض (ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ ۲/۲۲۸)۔

(ii) جو عورتیں سن رسیدہ ہو چکی ہوں یا جنہیں کسی اور وجہ سے حیض نہ آ سکتا ہو۔ ان کی عدت ۳ ماہ ہوگی۔

(iii) حاملہ عورت کی عدت وضع حمل تک ہوگی۔ (۶۵/۴)۔

(iv) جس عورت کو ہاتھ لگانے سے قبل طلاق دی گئی ہو اس کی کوئی عدت نہیں (۳۳/۴۹)۔

(س) موجودہ قوانین میں "تین طلاق" کی مزید وضاحت ضروری ہے۔ قرآن کریم کی رو سے اس کی صورت یوں ہے کہ جب کوئی عدالت کسی مرد اور عورت کے نکاح کی تنسیخ کر دے تو یہ پہلی مرتبہ کی طلاق کہلائے گی۔ اس کے بعد یہ مرد اور عورت پھر آپس میں میاں بیوی کی حیثیت سے رہ سکتے ہیں۔ اگر ان میں دوبارہ فسخ نکاح کی نوبت (بذریعہ عدالت) آ جائے تو یہ دوسری طلاق ہوگی۔ اس کے بعد بھی اس کی گنجائش ہوگی کہ یہ پھر میاں بیوی کی حیثیت سے رہ سکیں لیکن اگر اسی طرح تیسری مرتبہ فسخ نکاح ہو گیا تو پھر یہ عورت اس مرد کے نکاح میں نہیں آ سکے گی۔ ہاں اگر یہ عورت کسی اور مرد سے شادی کر لے اور اس سے بھی فسخ نکاح ہو جائے تو یہ اس پہلے خاوند کے نکاح میں آ سکے گی۔

اس قانون میں، یہ ترامیم بڑی ضروری ہیں۔

۳۔ یتیم پوتے کی وراثت

موجودہ قوانین میں، یتیم پوتے کو حقِ وراثت دلایا گیا ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ اسے زیادہ وضاحت سے بیان کیا جائے۔ نیز اس حقِ وراثت کو مرتِ یتیم پوتے تک محدود نہ رکھا جائے۔ اگر دادا کی وفات کے وقت یتیم پوتا بھی وفات پا چکا ہو تو حقِ وراثت اس کے بیٹے تک پہنچے گا۔ لہٰذا قانون کے الفاظ ایسے جامع ہونے چاہئیں جو اس حق کو، اس اولاد کے آخری سلسلہ تک پہنچا دیں۔

ہمارے خیال میں بہتر یہ ہوگا کہ ان قوانین کی متعلقہ دفعات کو از سرِ نو مدون کیا جائے تاکہ بات بالکل واضح اور غیر مبہم ہو جائے۔

آخر میں ہم محترم صدرِ مملکت اور اراکین مرکزی اسمبلی کو مستحق مبارکباد قرار دیتے ہیں کہ انہوں نے موجودہ قوانین کو قرآن کریم کے قریب لانے کے لئے اس قدر کوشش کی ہے۔ امید ہے کہ وہ ان قوانین کو اور اسی طرح بتدریج، ملک کے دیگر قوانین کو، قرآن کریم کے عین مطابق بنانے کے لئے اسی طرح قدم اٹھاتے رہیں گے، جس کے لئے وہ عند الناس مشکور اور عند اللہ ماجور ہوں گے۔

ضرورتِ خوشنویس

ادارہ طلوعِ اسلام میں دہلوی طرز نگارش کے ایک ایسے کتابی کاتب کی ضرورت ہے جو نسخ و نستعلیق خط میں یکساں مہارت رکھتا ہو۔ (ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور۔)

(فون نمبر ۸۰۸۰۰)

رابطۂ باہمی

(بزمہائے طلوع اسلام کی ماہانہ رپورٹیں)

لاہور

ہالینڈ کے مستشرق، پروفیسر بالجون آج کل لاہور آئے ہوئے ہیں۔ یہ "ماڈرن مسلم قرآن انٹرپریٹیشن" کے مصنف ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے عصر حاضر میں تفسیر قرآن کریم کے سلسلہ میں جو کوششیں ہو رہی ہیں ان کا جائزہ لیا ہے اور اس سلسلہ میں پرویز صاحب کی تعبیرات کا بڑا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ انہوں نے ہالینڈ سے چلنے سے پہلے ہی پرویز صاحب سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا تھا۔ چنانچہ لاہور آنے پر وہ انہیں ملنے کے لئے آئے۔ بزم لاہور کی طرف سے ان کے اعزاز میں ۲۹ رنومبر کی شام کو استقبالیہ کا انتظام کیا گیا جس میں شہر کے اکثر ارباب فکرو نظر نے شرکت کی۔ اس اجتماع میں بڑے اہم موضوعات زیر بحث آئے اور معزز مہمان نے مختلف سوالات کے جواب میں اسلام کے متعلق اپنے نکتۂ نگاہ کی وضاحت کی۔ یہ اجتماع حسین بھی تھا اور مفید بھی۔ آخر میں بزم کی طرف سے پروفیسر موصوف کی خدمت میں پرویز صاحب کی تصانیف کا ایک سیٹ تحفۃً پیش کیا گیا۔ پروفیسر صاحب یکم دسمبر کی صبح، پرویز صاحب کے درسِ قرآن کریم میں بھی شریک ہوئے۔

بزم کی دیگر مساعی حسب سابق آگے بڑھ رہی ہیں۔ ۲۵ر دسمبر کی صبح، قائد اعظم کے یوم ولادت کی تقریب پر وائی۔ ایم۔ سی۔ اے۔ ہال میں پبلک جلسہ منعقد کیا جا رہا ہے۔ جس میں پرویز صاحب کی تقریر کا عنوان ہوگا۔

مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

راولپنڈی

بزم کے ہفتہ واری اجتماعات ہر جمعہ کی شام کو باقاعدگی سے الکوثر میں ہوتے ہیں۔ ان اجتماعات میں پرویز صاحب کا درسِ قرآن بذریعہ ٹیپ سنایا جاتا ہے۔ علاقہ صدر میں اجتماع کے لئے اتوار کا دن طے پایا ہے۔

اراکین بزم کے احتساب کے سلسلے میں ہر ماہ ایک خصوصی اجتماع کا اہتمام کیا گیا ہے۔ جس میں یہ امر پیش نظر رکھا جائے گا کہ احباب اپنی زندگی میں کس حد تک قرآنی احکام کے مطابق تبدیلی پیدا کر رہے ہیں۔

ڈھاکہ

۲۷ نومبر کی شام کو بزم کا ماہانہ اجلاس شہاب صاحب کے دولتکدہ پر ہوا۔ کارروائی کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ اور بعد ازاں ان آیات کو مفہوم القرآن کی روشنی میں احباب کے سامنے لایا گیا۔ سورۂ یونس کی یہ آیات قرآنی تحریک کے مختصر سے کاروانِ شوق کے لئے نشانِ منزل کی حیثیت لئے ہوئے تھیں۔ بزم کے دارالمطالعہ کی توسیع تدریجی مراحل سے گزر رہی ہے۔ ٹیپ ریکارڈر کی خرابی کے باعث پرویز صاحب کے درس قرآن کے لئے تشنگی برابر محسوس ہوتی رہی۔ بزم کی رکنیت کا سلسلہ آگے بڑھانے کے متعلق یہ طے پایا کہ ایسے حضرات کو رکن بنایا جائے جو قرآنی فکر کو کافی طور پر سمجھ چکے ہوں اور قلب و نگاہ کے اعتبار سے اس سے متفق ہوں۔ مشرقی پاکستان کے خریدارانِ طلوعِ اسلام کو بذریعہ سرکلر مطلع کر دیا گیا ہے کہ وہ حسب ضرورت پمفلٹوں کے لئے بزم سے رابطہ پیدا کریں اور پرویز صاحب کی مطبوعات کے لئے "پاک کتاب گھر" ڈھاکہ سے۔ محترم سراج الاسلام صاحب سے گزارش کی گئی تھی کہ وہ "انسان کے بنیادی حقوق" کے زیرِ عنوان پرویز صاحب کے سابقہ کنونشن کے اہم خطاب کا بنگلہ میں ترجمہ کریں تاکہ مشرقی پاکستان کے اہل علم کے لئے اس کی اشاعت کا اہتمام ہو سکے۔ محترم مولانا موصوف نے یہ کام بخوشی اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ (مولانا صاحب کا شکریہ۔ طلوع اسلام)

"حاصلِ مطالعہ" کا پروگرام بے حد مفید ثابت ہو رہا ہے۔ اس سے احباب میں تدبر فی القرآن اور مطالعہ کا شوق بڑھ گیا ہے۔ بزم کا آیندہ اجلاس محترم صابر علی صاحب کے ہاں ہو گا۔

مردان

۱۰ اواخر اکتوبر میں بزم کا ماہانہ اجلاس ہوا۔ "کیریکٹر کسے کہتے ہیں؟" کے عنوان سے پرویز صاحب کا بصیرت افروز خطاب بذریعہ ٹیپ سنایا گیا۔ اجلاس میں زیادہ تر تعلیم یافتہ لوگ موجود تھے اور وہ سب اس خطاب سے متاثر تھے اور سب نے اسے پسند کیا۔ خاتمہ اجلاس پر پمفلٹس بھی تقسیم کئے گئے۔ درس قرآن کا سلسلہ کامیابی سے جاری ہے۔ بزم نے بہت سی کتابیں ادارہ سے خرید کی تھیں۔ ان میں سے کچھ مفت تقسیم کی گئی ہیں اور جو لوگ قیمتاً حاصل کرنا پسند کرتے ہیں ان سے قیمت وصول کر لی جاتی ہے۔

بستی بیرمانی

بزم دن رات دیہات کی فضا میں قرآنی فکر کی روشنی پھیلانے میں کوشاں ہے۔ علمی فقدان کے

باعث اس راہ میں بڑی مشکلات درپیش ہیں۔ لیکن اراکین بزم اس سے مایوس نہیں۔ چوٹی زیریں کے سرگرم رفیق محترم قاضی منظور احمد صاحب کی کوششوں نے بھی قرآنی فکر کو کافی آگے بڑھایا ہے۔ محترم حکیم خدا بخش خاں اور نمایندہ بزم محترم مہر علی خاں کی سعی مسلسل خوش اسلوبی سے بارآور ہو رہی ہے۔ احباب نے اپنی غربت کے باوجود میزان سے کچھ مزید کتب منگوانے کا انتظام کیا ہے۔

بوریوالہ

احباب کی بعض مصروفیتوں کی بنا پر ماہ رواں میں تین اجتماع ہو سکے۔ مقامی کالج کے طلبا میں "پاکستان کس نے بنایا؟" پمفلٹ تقسیم کیا گیا۔ اور اس طبقہ میں یہ بڑا مقبول ہوا۔

میانوالی

۶ دسمبر اور ۱۳ دسمبر کو بزم کے ہفتہ وار اجتماع ہوئے۔ جن میں اراکین بزم کے علاوہ دیگر معززین نے بھی شرکت کی۔ ۶ دسمبر کے اجتماع میں محترم طالب حسین معہ چند دیگر احباب لاہور شریک ہوئے انہوں نے اس اجتماع میں پرویز صاحب کی تقریر بعنوان "شہنشاہ بوریہ نشین" سنائی، جسے بے حد پسند کیا گیا۔ ۱۳ دسمبر کو سردر صاحب معہ دیگر احباب لاہور شریک اجلاس ہوئے۔ انہوں نے پرویز صاحب کی ایک اور تقریر بذریعہ ٹیپ سنانے کا اہتمام کیا۔ پرویز صاحب کی ان ٹیپ شدہ تقاریر نے بڑے خوشگوار اثرات مرتب کئے اور ان سے اس جھوٹے پروپیگنڈہ کا بخوبی ازالہ ہو گیا جو مخالفین نے عرصہ سے بپا کر رکھا تھا۔

بزم لاہور چھاؤنی

بزم کے ہفتہ وار اجلاس ہر جمعہ کی شب کو باقاعدگی سے ہوتے ہیں۔ ۲۰ دسمبر کے اجلاس میں محترم امیر الدین نمائندہ بزم نے تحریک "طلوع اسلام" کے اغراض و مقاصد پر تقریر کی۔ انہوں نے اعلان کیا کہ تحریک طلوع اسلام کا مقصد یہ ہے کہ قرآنی فکر کو عام کیا جائے۔ مذہبی فرقہ بندی سے بالاتر رہ کر اراکین بزم خدمت خلق کو اپنا شعار بنائیں۔ انہوں نے اراکین کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی زندگیوں کو قرآنی احکام کے سانچے میں ڈھالیں۔ اور تمام غیر قرآنی رسومات سے کنارہ کشی اختیار کریں۔ حاضرین پر نمایندہ بزم کی مدلل تقریر کا بہت اثر ہوا۔ بعض اہل علم حضرات کئی ماہ سے اجلاس میں شرکت کرتے ہیں۔ چنانچہ تحریک کو علی وجہ البصیرت سمجھنے کے بعد انہوں نے اعلان کیا کہ وہ اس قرآنی تحریک کو اب قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اپنے مکمل تعاون کا یقین دلاتے ہیں۔ بزم کے ہر اجلاس میں پمفلٹوں کی تقسیم بھی کی جاتی ہے اور اس سے بڑے خوش گوار نتائج سامنے آ رہے ہیں۔

توکّل کِسے کہتے ہیں

حامد اپنے ابّا کے ساتھ اپنے چچا کے ہاں گیا۔ وہاں اس کی چچی بیمار تھی۔ اس کی حالت نازک تھی۔ وہاں اُس کی موجودگی میں بہت سے لوگ بیمار کی خبر پوچھنے کے لئے آئے۔ اُن میں ایک بڑے میاں بھی تھے۔ انہوں نے جاتے وقت حامد کے چچا سے کہا۔ میاں! اس قدر دوڑ دھوپ کرنے اور پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ پہ توکّل کرو۔ وہی سب کچھ کرتا ہے۔

واپسی پہ حامد نے اپنے ابّا سے کہا۔ ابا جان! میں اُن بڑے میاں کی بات نہیں سمجھ سکا۔ "اللہ پہ توکّل کرو وہی سب کچھ کرتا ہے" اللہ پہ توکّل کرنے کا مطلب کیا ہے؟

حامد کے ابّا نے کہا بیٹا! یہ بڑی اہم بات ہے جو تم نے پوچھی ہے۔ اسے غور سے سنو اور اچھی طرح سمجھو۔

تم پانی میں ایک چھوٹی سی کنکر پھینکو، وہ فوراً ڈوب جائے گی۔ لیکن تم نے کراچی میں دیکھا تھا۔ کتنے کتنے بڑے جہاز سمندر میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر تیرتے پھرتے تھے۔ ایک جہاز کا اپنا وزن ہی ہزاروں

من کا ہوتا ہے۔ پھر اس میں ہزاروں من سامان بھرا ہوتا ہے اور ہزاروں سواریاں بھی بیٹھ جاتی ہیں۔ اور وہ ان سب کو لے کر روانہ ہو جاتا ہے اور ہزاروں میل کا سفر سمندر میں طے کرتا ہے۔ مسافر بھی اسی میں نہایت اطمینان سے بیٹھ جاتے ہیں۔ کسی کو اس کا خطرہ نہیں ہوتا کہ جہاز پانی میں ڈوب جائے گا۔ یہی کیفیت ہوائی جہاز کی ہے۔ مسافر اس میں بھی نہایت اطمینان سے بیٹھ جاتے ہیں۔

ان جہازوں میں لوگ اس قدر اطمینان سے کیوں بیٹھ جاتے ہیں؟ اس لئے کہ انہیں اس پر بھروسہ ہوتا ہے کہ پانی کا جہاز ڈوبے گا نہیں۔ ہوائی جہاز گرے گا نہیں۔

یہ جہاز ڈوبتے کیوں نہیں۔ یا گرتے کیوں نہیں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا قانون بنا دیا ہے کہ اگر اس قسم کا جہاز ہو اور اس میں اتنا وزن ہو تو وہ پانی میں ڈوبے گا نہیں۔ یا ہوا میں نیچے نہیں گرے گا۔ جہاز چلانے والوں کو خدا کے اس قانون پر اس قدر پختہ بھروسہ ہوتا ہے کہ وہ بغیر کسی قسم کی پریشانی یا خوف کے، جہازوں کو اِدھر سے اُدھر لے جاتے ہیں۔

خدا کے قانون پر اس قدر پختہ بھروسے کو توکّل کہتے ہیں۔

"لیکن ابا جان! بعض اوقات جہاز ڈوب بھی جاتے ہیں۔ اور ہوائی جہازوں کو بھی حادثے ہو جاتے ہیں۔ تو اس کی

کیا وجہ ہے؟" حامد نے پوچھا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی جہاز بنانے والوں سے غلطی ہو جاتی ہے اور کبھی جہاز چلانے والے احتیاط نہیں برتتے۔ اس لئے حادثے ہو جاتے رہیں۔ ورنہ خدا کے قانون میں کوئی نقص نہیں ہوتا۔ اس پر پورا پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

حامد نے اس پر کہا کہ ابا جان وہ جو بڑے میاں نے چچا جان سے کہا تھا کہ کسی قسم کی دوڑ دھوپ یعنی کوشش نہ کرو۔ خدا پر توکل رکھو۔ وہی سب کچھ کرتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے ٹھیک نہیں کہا تھا۔

ہاں بیٹا! انہوں نے ٹھیک نہیں کہا تھا۔ انسان کو چاہیئے کہ پہلے خدا کے قانون کو اچھی طرح سمجھے۔ اس کے مطابق پوری پوری کوشش کرے۔ اس میں کوئی کمی یا نقص نہ رہنے دے۔ اس کے بعد یقیناً کامیابی ہو گی۔ قرآنِ مجید نے جب کہا ہے کہ "مومن خدا پر توکّل کرتے ہیں" تو اس کا یہی مطلب ہے۔

حامد نے کہا "ابا جان! اب میں یہ بات اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ قرآن شریف ہمیں کیسی اچھی اچھی باتیں بتاتا ہے"

(آپا ثریا عندلیب)